۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی

مظہر امروہوی

مظہر امروہوی

ترتیب

پس منظر

سکندرِ اعظم سے بابر تک کتنے ہی فاتح نصرت و کامرانی کے پرچم اڑاتے برِّصغیر کے سینے پر گزر گئے۔ ان میں سے بعض اپنی طاقت کا لوہا منوانے اور بعض دولت سمیٹنے یہاں آئے تھے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر اُلٹے پیروں واپس چلے گئے۔ تاہم اکثریت ایسے حملہ آوروں کی تھی جنھیں جنگ و جدل کا جنُون تھا، نہ دولت کی ہوس بلکہ اپنی طاقت کی نمائش سے زیادہ اُنھیں رہنے کے لیے زرخیز علاقے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے اس سرزمین پر قدم جمانے کے بعد نہ تو پُرامن شہریوں کا قتلِ عام کیا اور نہ کسی قسم کی لوٹ کھسوٹ کی۔ ان تاجداروں نے ملک کے جس حصّے پر قبضہ کیا وہاں کے عوام کو انصاف پسند اور مستحکم حکومت دی، رعایا کے دُکھ سُکھ کا خیال رکھا، اُس کے لیے پُل، سڑکیں اور سرائیں تعمیر کرائیں، عدالتیں قائم کیں اور حکومت کے کاروبار میں مقامی آبادی کو برابر کا شریک کیا۔

ایسے حکمرانوں میں مغل بادشاہ رواداری اور رعایا پروری میں سب پر سبقت لے گئے۔ اُنھوں نے غیر مسلموں سے رشتے قائم کیے اور اُنھیں

کلیدی عہدے تک دیے۔

مشرقی اور مغربی مؤرخوں نے مسلم دورِ حکومت کی آٹھ سو سالہ تاریخ کو الگ الگ انداز اور اسلوب سے لکھا ہے۔ مگر اس حقیقت پر سب متفق ہیں کہ مسلمان تاجداروں نے ہندوستان پر غیروں، اجنبیوں یا دشمنوں کی طرح حکومت نہیں کی بلکہ اس سرزمین کو اپنا وطن بنایا اور آخر وقت تک اپنا وطن ہی سمجھتے رہے۔ یہ مسلم حکمران اگر چاہتے تو اپنے اپنے دورِ حکومت میں یہاں کے مجبور اور کمزور عوام کو بزورِ شمشیر مسلمان بنا کر مطلع کو اس گرد و غبار سے صاف کر سکتے تھے جو آگے چل کر "اکثریت" کا بادل بن گیا۔

پھر بھی مسلمانوں کا حُسنِ سلوک رائگاں نہیں گیا۔ اسی کی بدولت انھوں نے مقامی آبادی کا تعاون حاصل کیا جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی تک قائم رہا۔ اس ملک گیر تحریک میں غیر ملکی تسلّط کے خلاف تمام قوموں کا اشتراک اور تعاون ہی غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے اچھے سلوک کا ثبوت تھا۔

یوں تو ہندوستان کے لیے غیر ملکیوں کی آمد کوئی نئی اور قابلِ ذکر بات نہ تھی، مگر ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء وہ منحوس تاریخ تھی جب موجودہ تہذیب و تمدّن کے علمبردار جہالت، بربریت اور شقاوت کے تحفوں سے لدے پھندے واسکوڈی گاما کی سرکردگی میں کالی کٹ کی بندرگاہ پر اُترے۔ اس بالکل اجنبی قوم نے ساحل پر قدم رکھتے ہی جور و استبداد کا کھیل شروع کر دیا۔ پرتگیزی زیادہ عرصہ یہاں رہ جاتے تو افریقہ کی طرح برصغیر بھی تاریکیوں کی لپیٹ میں آجاتا۔ جلد ہی دوسری اقوام نے بھی برصغیر کا رُخ کیا اور رفتہ رفتہ فرانس اور انگلستان کے لوگوں نے پرتگیزیوں کو اس

علاقے سے نکال باہر کیا۔

پرتگیزیوں کے بعد اہلِ فرانس کی باری آئی۔ انگریزوں نے اپنی مخصوص شاطرانہ چالوں سے کام لے کر انھیں ہر محاذ پر شکست دی اور ہندوستان کی بساطِ سیاست پر عیاری، بدعہدی اور حکمتِ عملی کے انگریزی مُہرے دوڑنے لگے۔ پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدیداروں نے اس مُلک پر اپنا تسلّط قائم کرنے کے لیے وہ مذموم طریقے اختیار کیے جو آج بھی انگریزوں کے قومی وقار کو بُری طرح مجرُوح کرتے ہیں۔

مرکز کی کمزوری نے ہندوستان میں طوائف الملوکی اور حکمران خاندانوں میں رقابت پیدا کر دی تھی۔ ان کی باہمی نا انصافی اور جانشینی کے جھگڑوں نے کمپنی کو اپنی حکومت قائم کرنے میں بڑی مدد دی اور اس نے مقامی حکمرانوں کی کمزوری سے واقف ہوتے ہی پُورے مُلک پر قابض ہو جانے کا پروگرام بنا لیا۔ مگر انگریز فرانسیسیوں کی طرح جلد باز نہ تھے۔ وہ اگر ابتدا ہی میں دیسی نوّابوں اور راجاؤں کو ہٹا کر جگہ جگہ اپنی عملداری قائم کرنے لگتے تو جو آگ ۱۸۵۷ء میں بھڑکی وہ بہت پہلے ہی اُن کے اقتدار کو جلا کر راکھ کر چکی ہوتی۔

وہ ایسی ریاستوں کی تاک میں لگے رہتے جہاں خاندانی جھگڑے چل رہے ہوتے۔ موقع ملتے ہی وہ اُس خاندان کے سرپرست بن جاتے اور کسی ایک کا ساتھ دے کر اُسے وقتی طور سے کامیاب کرا دیتے۔ پھر جب تک ممکن ہوتا اُس بدنصیب شخص سے جاگیر یا نقد رقم کی صُورت میں اپنے تعاوُن اور سرپرستی کی قیمت وصول کرتے رہتے اور جب وہ کچھ دینے کے قابل نہ رہتا تو کسی بہانے

سے اُسے گدّی سے محرُوم کر دیتے۔ اس طرح اُن کا کوئی حلیف کبھی چین سے نہ بیٹھ سکتا تھا۔

اگر کوئی بلند حوصلہ اور خوددار والی اُن سے دشمنی مول لے لیتا تو اُسے حریفوں کے ہاتھوں ختم کرا دیا جاتا۔ غرض اُن کی دوستی اور دُشمنی یکساں طور پر تباہ کُن تھی۔ دشمنوں کے لیے خاردار جال استعمال ہوتا اور دوستوں کو مضبُوط ریشمی ڈوریوں سے جکڑ دیا جاتا، جس کا مختصر جائزہ اس طرح لیا جا سکتا ہے :

(۱) ٹیپو سُلطان کا چراغ نظام اور مرہٹوں کی مدد سے بُجھایا گیا۔

(۲) حیدر آباد کے ناصر جنگ اور مظفّر جنگ، اور کرناٹک کے نوُرالدین، چندا صاحب اور محمد علی کی چپقلش سے فائدہ اُٹھا کر جنوبی ہند پر قبضہ کر لیا گیا۔

(۳) بنگال میں تیتو میر نے آزادی کا پرچم بلند کیا تو اُنھیں شہید کر دیا گیا۔ اُن کے ساتھی پھانسی پر چڑھا دیئے گئے۔ کچھ جیلوں میں ٹھونس دیے گئے۔

(۴) بنگال، بہار اور اُڑیسہ کے سرسبز و شاداب علاقے پر نواب سراجُ الدّولہ کی حکومت تھی۔ میر جعفر اور دُوسرے اُمرا سے ساز باز کر کے پہلے اُس جانباز کو راستے سے ہٹایا گیا۔ پھر مختلف حیلوں بہانوں سے میر جعفر اور میر قاسم کو بھی سڑے ہوئے پھلوں کی طرح دُور پھینک دیا گیا۔

(۵) شمال میں سِکھ ریاستوں کو آپس میں لڑا کر اُن کی مرکزیت ختم کر دی گئی۔ جب پنجاب چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو جا بجا انگریزی چھاؤنیاں قائم کر دی گئیں۔

(۶) سندھ کی ریاستوں کو سکھوں کے غلبے سے خطرہ تھا۔ انگریزوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ان سے معاہدہ کر کے اُن کی حفاظت کا ذمّہ لے لیا۔ اس طرح تمام چھوٹی بڑی ریاستیں اُن کے جال میں پھنس گئیں۔

(۷) دہلی میں بادشاہ کا وجود برائے نام تھا۔ مگر خاندانِ مُغلیہ کا یہ ٹمٹماتا ہُوا چراغ بھی انگریزوں کی نظر میں کھٹک رہا تھا۔ چنانچہ بادشاہ کا وظیفہ مقرر کر کے اور حفاظت کے نام پر انگریزی فوج تعینات کر کے اس کو پُوری طرح اپنے قابو میں کر لیا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ جس علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہتی، اُس کا ایک حصّہ اپنے پاس رکھتی اور عوام کو مُطمئن کرنے کے لیے باقی علاقے میں ایک محکوم و مجبور حکومت قائم کر دیتی تھی۔ بادشاہی اور نوّابی کے ان مجسّموں کو شاہی لباس پہنا کر اور سونے کے پنجروں میں بند کر کے کسی بلند اور نمایاں مقام پر رکھ دیا جاتا تھا۔ اُس دَور کے پنجرے ہندوستان کے نقشے پر جا بجا رکھے ہُوئے نظر آتے ہیں۔ شاہِ دہلی، والیٔ اودھ، نظامِ دکن، مرہٹہ ریاستیں اور پنجاب کی سکھ ریاستیں اسی زمرے میں شامل ہیں۔

کمپنی وقت کی منتظر رہتی۔ جُونہی حالات اجازت دیتے، کمپنی کے تہنجے اُس خطّے میں مضبُوطی سے گڑ جاتے۔ ان پنجروں اور مجسّموں کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا جاتا اور علاقے پر قبضہ کر لیا جاتا تھا۔ لارڈ ویلزلی اور لارڈ ڈلہوزی نے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں بہت حصّہ لیا۔ اُن میں سے ایک کی معتدل روی اور دُوسرے کی توسیع پسندی میں صرف مصلحتِ وقت کا فرق تھا۔

جنگِ آزادی سے پہلے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں یا تو خالص انگریزی حکومت تھی یا ایسے مقامی نوابوں اور راجاؤں کی عملداری جو پوری طرح انگریزوں کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے۔

انگریزی علاقوں میں عوام کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ عوام کے ساتھ کمپنی کے اہل کاروں کا برتاؤ نہایت ظالمانہ تھا۔ رشوت کا بازار گرم تھا۔ صنعت اور تجارت عوام کے ہاتھوں سے نکل کر چند ساہوکاروں کی تجوریوں میں بند ہو گئی تھی۔ زرخیز زمینوں اور شاداب فصلوں پر انگریزوں یا سخت گیر اور بے رحم مقامی زمینداروں کا قبضہ تھا۔ کہیں کہیں کسانوں سے زبردستی غلہ بھی چھین لیا جاتا اور سستے داموں خریدی ہوئی اشیا کو منھ مانگی قیمت پر فروخت کیا جاتا تھا۔ اس جابرانہ نظام کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو قید، جرمانے اور کوڑوں کی سزا دی جاتی تھی۔

شہری زندگی میں بھی عوام کو خوش حالی میسّر نہ تھی۔ مقامی باشندوں کو بلالحاظ حیثیت و مرتبہ انگریز سے کمتر سمجھا جاتا تھا۔ سمندر پار سے آنے والے تاجر اور حکّام اس ملک کے مستقل قیام سے کتراتے تھے۔ وہ کچھ عرصہ ہندوستان میں گزار کر اپنے وطن واپس چلے جاتے تھے۔ اُن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جائز یا ناجائز طریقوں سے کم سے کم مدّت میں زیادہ سے زیادہ دولت کما لیں اور وطن پہنچ کر اپنے ہم چشموں میں برتری حاصل کریں۔ اسی لیے اُنھیں نہ ملکی مسائل سے دلچسپی تھی نہ عوام سے واسطہ۔ انگریزی افواج کے دیسی سپاہی بھی غیر ملکی حاکموں کے جابرانہ سلوک سے عاجز آ گئے تھے۔ وہ دیسی نوابوں کے سپاہیوں کا بلند معیارِ زندگی دیکھتے تو اُن کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے طوفان اُٹھ کھڑے

ہوتے تھے۔

ادھر دیسی رئیسوں کی عملداری میں بھی عوام کچھ مطمئن نہ تھے۔ انگریزوں سے معاہدوں کی قینچی نے ان نوابوں اور راجاؤں کے پَر کاٹ دیے تھے۔ ان میں سے بیشتر انگریزوں سے مرعوب اور خوفزدہ تھے جن میں پنجاب کی سکھ ریاستیں سرِ فہرست تھیں۔ ان کی تمامتر کوشش یہی تھی کہ انگریزوں کے زیرِ سایہ اپنی مصنوعی شان وشوکت کو برقرار رکھیں۔

ان بدنصیب نوابوں کی حفاظت کے نام پر جو انگریزی فوج رکھی جاتی تھی، اس کا خرچ پُورا کرنے اور انگریز افسروں کے پیمانۂ ہوس کو بھرنے کے لیے جتنی رقم درکار ہوتی، وہ غریب عوام ہی سے چھینی جاتی تھی۔ ایسے بُزدل اور عیاش رئیسوں کی رعایا کس طرح سکون کی زندگی گزار سکتی تھی۔

ان رئیسوں اور جاگیرداروں میں کچھ حسّاس اور قوم پرست بھی تھے۔ اپنے وطن پر غیر ملکی اور اجنبی قوم کا تسلط دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے رہتے۔ مگر اُن میں اتنی جُرأت نہ تھی کہ آزادی کا پرچم بلند کر کے محلسراؤں سے باہر نکل پڑتے۔ جب تحریکِ آزادی نے ملک گیر حیثیت اختیار کر لی تب بھی وہ اُس سے الگ تھلگ رہ کر نتائج کا انتظار کرتے رہے۔ ان لوگوں نے گو جنگِ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ نہ دیا مگر اُن کے تذبذب نے انگریزوں کے مشن کو تقویت بخشی۔ یہ لوگ اگر اپنی عملداری میں رعایا کو مطمئن اور خوش حال رکھنے کی کوشش کرتے تو اُن کی قومی کوتاہیوں سے درگزر کیا جا سکتا تھا۔ مگر افسوس انھوں نے اپنی رعایا کے ساتھ بھی انصاف نہ کیا۔

بہرحال، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے اس وسیع و عریض ملک میں نہ عوام مطمئن تھے نہ خواص۔ ہر شخص اپنی جگہ پر بے چین اور آنے والے کسی بڑے طوفان کا منتظر تھا۔ انگریزی علاقہ ہو یا مقامی حکومت، استحکام نہ ہونے کی وجہ سے ہر جگہ ایک انتشار اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ طوائف الملوکی اور چھوٹی چھوٹی غیر مستحکم ریاستوں کا جابرانہ نظام، بے روزگاری اور نت نئی معاشی مشکلات کو جنم دے رہا تھا۔ یہی وہ حالات تھے جن میں ایک ایسی سرزمین پر انگریزوں کے خلاف نفرت اور حقارت کا آتش فشاں پھٹ پڑا جس نے ہمیشہ غیر ملکیوں کو خوش آمدید کہا تھا۔

جنگِ آزادی یا بغاوت؟

انگریز یا انگریز پرستوں نے ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کو بغاوت کا نام دیا حالانکہ رعایا میں سے کوئی فرد یا کوئی مخصوص طبقہ حصولِ اقتدار کی خاطر یا ذاتی رقابت کی بنا پر حکومت کے خلاف کسی طرح کی سرکشی کرے تو اُسے بغاوت کہا جاتا ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ باغیانہ جدّوجہد میں کوئی اصلاحی، اخلاقی، قومی یا مذہبی جذبہ شامل نہ ہو۔ لیکن کسی اجتماعی اور متفقہ عدمِ اعتماد کا اظہار یا اس سلسلے میں کوئی عملی اقدام کسی طرح بغاوت کی تعریف میں نہیں آتا۔ اس کو بہرصورت ایک قومی جنگ کہا جائے گا جس کی نظیر ۱۸۵۷ء میں اہالیانِ ہندوستان نے پیش کی تھی۔ سیواجی کی تحریک البتہ ایک کھُلی ہوئی بغاوت تھی۔ کیونکہ اُس نے سارے ہندوستان کے تسلیم شدہ بادشاہ کے خلاف تلوار اُٹھائی تھی۔ وہ جس علاقے کا رہنے والا تھا وہ پہلے سے اورنگ زیب کے زیرِ نگین تھا۔ بادشاہ اور باغی دونوں ایک ہی مُلک کے رہنے والے تھے۔ شمال سے جنوب تک کا چپّا چپّا مختلف شاخوں کی طرح ایک مضبوط تنے سے جُڑا ہوا تھا۔ ان حالات میں کسی ایک شخص یا گروہ کا اپنے علاقے میں من مانی کارروائیاں کرنا اور لُوٹ مار کرکے بادشاہ کی رعایا کو پریشان کرنا، بغاوت ہی کہلائے گا۔

انگریزوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس ملک کی قانونی حاکم نہ تھی اور نہ یہاں کے سکوں پر اس کا نام چلتا تھا۔ انگریز کی دی ہوئی سند کی اہمیت ردّی کاغذ سے زیادہ نہ تھی۔ کہیں کہیں حکومت میں اُن کا صرف اتنا حصّہ ضرور تھا کہ وہ مقامی حاکم کی منظوری سے وہاں کا انتظام سنبھال لیتے تھے اور اس طرح کچھ رقم وصول کر لیتے تھے، جیسے کوئی سینہ زور شخص بزدل رئیسوں سے اُن کی حفاظت کے بہانے اپنا خرچ وصول کرتا ہے۔ ان حالات میں جب کہ ہندوستان کے باشندے اُن کی رعایا ہی نہ تھے اور وہ غاصب کی حیثیت سے اس پر مسلّط تھے، اگر اس مُلک کے حُرّیت پسندوں نے غاصبوں کے خلاف تلوار اُٹھائی تو اُسے بغاوت کا نام دے دینا دُنیا بھر کی آزادی پسند تحریکوں کی توہین ہے۔ اگر کوئی نووارد شخص کسی کے موروثی مکان پر دھوکے سے یا بزورِ بازو قبضہ کر لے تو اپنے مکان کی واپسی کے لیے اُس شخص کی مزاحمت کو بغاوت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

واقعات پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی غیر مُلکی تسلّط، غیر مانوس تہذیب، بڑھتے ہوئے مغربی رجحانات، لُوٹ کھسوٹ اور ساہوکارانہ نظام کے خلاف برِصغیر کے عوام کی پہلی متحدہ کوشش تھی۔

بعض غیر جانبدار اور انصاف پسند مغربی مؤرخوں کو چھوڑ کر انگریزوں کے ابتدائی دَورِ حکومت میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی دراصل مقامی فوجوں کی بغاوت تھی۔ ان کے علاوہ چند ہندوستانی مؤرخوں نے بھی مصلحت وقت کے تحت انگریزوں کو یہی باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہندوستان کے عام مسلمان ملوّث

نہ تھے۔

انگریزوں نے جب دوبارہ ہندوستان پر قبضہ کیا تو سب سے پہلے اپنے دشمنوں کو چھانٹ چھانٹ کر نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی۔ ہندوستان سے مختلف طرح کا جذباتی لگاؤ ہونے کے باعث مسلمان جنگِ آزادی میں پیش پیش رہے تھے، اس لیے انگریزوں کی نظر میں وہ اُن کے سب سے بڑے دشمن قرار پائے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سرسیّد نے نہایت دانائی اور جرأت سے کام لے کر "اسبابِ بغاوتِ ہند" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا اور انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کی نفرت اور کدورت کو دھونے کی کوشش کی۔ سرسید نے جو کچھ کیا، اُس زمانے کی مصلحت کا تقاضا وہی تھا۔

بہرحال اب انگریز رہے نہ اُس زمانے کی مصلحت۔ لہٰذا نئی نسل کے سامنے اُن تمام زہر آلود نشتروں اور کانٹوں کی نمائش ضروری ہے جنھیں مظلوم عوام کے سینوں میں پیوست کر کے اُنھیں تڑپنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ اسی تڑپ اور اضطراب کو حکومت کے جانبدار مؤرخوں نے ۱۸۵۷ء کے غدر کا نام دیا۔

تاریخ میں عموماً کسی بھی ناکام جنگِ آزادی کو بغاوت ہی کہا جاتا رہا ہے۔ تاہم جس آگ نے کرناٹک سے لے کر پشاور تک سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اُسے چند سرکش سپاہیوں کی بغاوت کہہ دینا، اُن کروڑوں انسانوں پر ظلم کے مترادف ہے جنھوں نے اپنی ہڈیوں کے ایندھن سے آزادی کے اس تنور کو بھڑکایا تھا۔ جہاں تک فوج کی اندرونی بغاوت کا تعلق ہے، اس قسم کے واقعات تو انگریزی افواج میں بار بار پیش آتے رہے تھے اور ہر دفعہ مخصوص طریقۂ جراحت سے اس درد کا

علاج کیا جاتا رہا تھا۔

بایں ہمہ اگر اس تحریک کو فوجی بغاوت تسلیم کر لیا جائے تو کئی ایسے سوال خود بخود اُبھرنے لگتے ہیں جن کا جواب تاریخ کے صفحات میں نہیں ملتا۔

(۱) فوجیوں کی بغاوت شہروں تک کس طرح پہنچی اور اگر عوام انگریز حکمرانوں سے خوش تھے تو انھوں نے سرکش فوج کا ساتھ کیوں دیا؟

(۲) شہر کی آبادی نے جگہ جگہ مورچے بنا کر کیوں مقابلہ کیا؟

(۳) فوجی بغاوت کچلنے کے لیے معصوم شہریوں کا قتلِ عام کیوں کیا گیا؟

(۴) بادشاہوں کو کیوں معزول کیا گیا؟

(۵) شاہزادوں کو کیوں قتل کیا گیا؟

(۶) فاتح افواج کو ہر شہر میں لُوٹ مار کی اجازت کیوں دی گئی؟

(۷) ہزاروں انسانوں کو پھانسی پر کیوں چڑھایا گیا؟

(۸) لاکھوں انسانوں کو ان کے گھروں سے نکال کر اور اُن کی آبائی جائداد سے محرُوم کر کے نانِ شبینہ کو محتاج کیوں کیا گیا؟

(۹) اگر یہ محض انگریزی فوج کے سرپھرے سپاہیوں کی بغاوت تھی تو وہ ستارے کون تھے جو جنگِ آزادی کے اُفق پر آج تک جھلملا رہے ہیں؟ کیا بہادر شاہ ظفر، بیگم حضرت محل، برجیس قدر، مہارانی جھانسی، عظیم اللہ خان، شہزادہ فیروز شاہ، جنرل بخت خان، جنرل محمود خان، مولوی احمد اللہ شاہ، مولوی فضل حق، نانا صاحب اور تانتیا ٹوپے انگریزی فوج کے سپاہی تھے؟

ظاہر ہے کہ جس تحریک میں بادشاہِ وقت، مختلف صوبوں کے گورنر،

ریاستوں کے نواب، مختلف مذاہب کے راہنما، دانشور اور لاکھوں کروڑوں عوام شریک ہوں، اُسے کسی خاص طبقے یا فرقے کی بغاوت نہیں کہا جا سکتا۔ کوئی چھوٹی سی ندی ایک ایسے سیلاب کو جنم نہیں دے سکتی جو پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ آزادی کی یہ جدّوجہد یقیناً ایک ہمہ گیر تحریک کے تحت ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تحریک مضبوط مرکز اور اعلیٰ قیادت سے محرُوم رہی اور یہی محرُومی اُس کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کے سلُوک، اُن کی اجنبیت، جارحانہ پالیسیوں، شاطرانہ چالوں، توسیع پسندی اور عوام کے دُکھ درد سے ناواقفیت نے لوگوں کو اُن سے بدظن کر دیا تھا۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کے لیے ایک جھٹکے کا منتظر تھا۔ سپاہیوں کی بغاوت نے اس لبالب جام کو حرکت دے دی اور وہ چھلک پڑا۔ بلکہ کہیں کہیں تو فوجوں کے اُٹھنے سے پہلے ہی رعایا نے عَلمِ بغاوت بلند کر دیا۔

انگریزوں سے نفرت کے اسباب

بلاشُبہ معاشرے کی بعض اقدار وقت اور مُلکی حالات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں مگر ان کی رُوح ہر دَور اور ہر مُلک میں یکساں رہتی ہے مثلاً ہر زمانے کا انسان اپنے عقیدے کے تحفظ کی خاطر، نیز بھُوک اور بے انصافی کے خلاف نبرد آزما رہتا ہے۔ روٹی چونکہ خواص کا مسئلہ نہیں ہے اس لیے وہ صرف ظلم، تشدّد اور حقارت آمیز سلُوک کو اہمیت دیتے ہیں جبکہ عوام روٹی کے مسئلے کو یا اپنے مذہب اور اپنے عقیدے کے تحفظ کو مقدم خیال کرتے ہیں۔

آزادی کی جدّوجہد میں بھی صُورت حال کچھ ایسی ہی تھی۔ اُس وقت کے ملکی حالات پر نظر ڈالنے سے مندرجہ ذیل حقائق معلوم ہوتے ہیں:

(۱) دیسی آبادی کے ساتھ انگریزوں کا سلُوک نہایت حقارت آمیز اور بہیمانہ تھا۔ اس کا فطری ردِّ عمل یہی ہُوا کہ ملک کے چپّے چپّے میں ان کے خلاف نفرت پھیل گئی۔

(۲) انگریزوں کے حاکمانہ طور طریق میں ایک طرح کی ضد پائی جاتی تھی۔ وہ اپنے

ہر جائز ناجائز حکم کو منوانے ہی میں اپنی شان سمجھتے تھے۔

(۳) عوام کتنے ہی سادہ لوح ہوں مگر وہ اتنا ضرور سمجھتے تھے کہ ایک بالکل مختلف قسم کے اطوار، عادات اور مذہب رکھنے والی اجنبی قوم رفتہ رفتہ اُن کے مُلک پر چھا رہی ہے۔

(۴) خواص جانتے تھے کہ اگر جلد ہی سدّباب نہ کیا گیا تو ایک دن یہ غیر قوم پُورے مُلک پر قابض ہو جائے گی۔ ان میں سے جن کے دِلوں میں جذبۂ حبُ الوطنی گرم تھا، وہ وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ کرتے رہتے اور ایسے موقع کی تلاش میں تھے جب ان اجنبیوں سے چُھٹکارا حاصل کیا جا سکتا۔

(۵) خواص نہ سہی مگر عوام کے دلوں میں اپنے بادشاہ کے لیے بڑی عقیدت تھی۔ جب وہ اُسے فرنگیوں کے سامنے بے دست و پا پاتے تو دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتے۔

(۶) باہر سے آئے ہوئے اجنبی لوگوں پر مقامی باشندوں کے جذبات کا احترام واجب تھا مگر انگریزوں میں مدبّروں کی تعداد کم اور تاجروں کی زیادہ تھی، اس لیے اُنھوں نے کبھی عوام کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ پے در پے ایسی حرکتیں کرتے رہے، جن سے نفرت کا یہ الاؤ اور بھی بھڑکا۔

(۷) انگریز تاجر فطری طور پر نہایت عیّار، جھوٹے اور بدمعاملہ تھے۔ جاگیرداروں اور نوابوں کے ساتھ ساتھ وہ ان معصوم عوام کو بھی دھوکا دینے اور جھوٹ بولنے سے نہ چوکتے تھے جو ان باتوں کے عادی نہ تھے۔ عوام اور خواص کے جس طبقے یا فرد سے اُن کا واسطہ پڑتا وہ اُن کی بات پر بھروسا نہ کر سکتا تھا۔

(۸) ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے دستور چلا آرہا تھا کہ مقامی باشندے اُس نووارد اور اجنبی شخص کو خوشی سے قبول کر لیتے جو اُن کے رسم و رواج اور معاشرے کو اپنا لیتا۔ مگر اس کے برعکس انگریز قوم نے ہندوستان کی روایات سے سمجھوتا کرنے کے بجائے مقامی آبادی پر اپنی تہذیب، تمدّن، لباس اور زبان ٹھونسنے کی کوشش کی۔ اُن کے طور طریق صاف بتا رہے تھے کہ اگر وہ ہزاروں سال بھی ہندوستان میں رہے، تب بھی سب سے الگ تھلگ رہیں گے۔ مسلمان تو اس سرزمین کے سابق حکمران ہونے کی وجہ سے انگریزوں کے رقیب تھے ہی، مگر انگریز ہندوؤں کے دل بھی نہ جیت سکے۔ عوام یورپی سیاست کے نشیب و فراز سے ناواقف ہوتے ہوتے بھی اتنا سمجھنے لگے تھے کہ اس اجنبی قوم کا طاقت ور ہاتھ رفتہ رفتہ اُن کی تہذیب اور ثقافت پر بھی پڑنے لگا ہے۔

(۹) انگریز قوم نے اگرچہ ہمیشہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ دوسروں کے مذہبی معاملات میں غیر جانبدار رہتی ہے مگر اپنے ابتدائی دَور میں اُنھوں نے جان بوجھ کر ایسے کام کیے۔ جن سے مقامی آبادی کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔ معاشی طور پر ہندوستان کی کمر توڑنے کے بعد انگریزوں نے جو دوسرا محاذ کھولا، وہ اپنے مذہب کی ترویج تھا۔ اس محاذ کے سب سے اہم مورچے مشنری سکول تھے۔ جن کا نظامِ تعلیم پادریوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ مسلسل عیسائیت کی تبلیغ کر رہے تھے پادری دیسی لوگوں کے اجتماعات میں بے خوف و خطر گھس جاتے اور اپنے مذہب کی خوبیاں اور دُوسرے مذاہب کی خامیاں گنانے لگتے۔ اُنھیں حکومت کا تحفظ حاصل تھا، اس لیے اُن کا تو کچھ نہ بگڑتا، مگر اس طرزِ عمل نے عام آبادی

کو اُن کی قوم سے بدظن کر دیا۔ جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ انگریز اُن کے مذہب کو مٹانے کے درپے ہیں تو مسلمان علماء اور ہندوؤں کے مذہبی رہنما اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ مسجدوں، مدرسوں، مندروں اور عام اجتماعات میں لوگوں کو اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ترغیب دیتے اور عوام کے دلوں میں آزادی کی رُوح پھونکتے تھے۔

(۱۰) انگریزوں نے مختلف بہانوں سے بے شمار جاگیریں ضبط کر لیں اور لوگوں کے وظیفے ختم کر دیے۔ اس طرح لاکھوں آدمی جو گھر بیٹھے آرام سے زندگی گزار رہے تھے، نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے۔ یہ تجربہ اُن کے لیے مالی طور پر کتنا ہی مفید رہا ہو مگر سیاسی حیثیت سے بے حد نقصان دہ ثابت ہوا کیونکہ انگریزی حکومت کا لاوا بہہ کر جہاں جہاں پہنچا، وہاں کے عوام اُن سے بیزار ہوتے گئے۔

(۱۱) انگریزی عدالتیں قائم ہوئیں تو لوگوں کی شکایات میں اضافہ ہو گیا۔ یہ عدالتیں فیصلوں میں تاخیر کا سبب بنتی تھیں۔ لوگوں کو نت نئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ قرضوں اور مالیانے کی عدم ادائیگی کی صورت میں جائدادیں نیلام ہونے لگیں تو فارغ البال لوگوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ قانون کی برتری قائم رکھنا اپنی جگہ ضروری سہی مگر رعایا کے حالات اور حیثیت کو سامنے رکھ کر قانون میں ترمیم نہ کرنا بے تدبیری کی دلیل ہے۔ اُس وقت کے انگریز حکّام میں تدبّر اور مصلحت بینی ہوتی تو وہ عوام میں بڑھتی ہوئی بے چینی کا سبب جاننے اور اُس کا تدارک کرنے کی کوشش کرتے۔ اُن کے لیے ایسے قوانین کا نفاذ مشکل نہ تھا، جن کی رُو سے خاص خاص حالات میں مالیہ کی عدم ادائیگی قانون کے عتاب کا سبب نہ بنتی مگر

ایسا نہیں کیا گیا۔

(۱۲) ہندوستان میں عربی، فارسی، اُردو یا پھر ہندی کا دَور دورہ تھا۔ انگریزی تسلّط کے بعد انگریزی کو بھی ان زبانوں میں شامل کر لیا گیا۔ اس عمل سے حسّاس اور دُور اندیش لوگوں کے کان کھڑے ہوئے مگر کوئی اعتراض نہ کر سکا۔ مگر جب سرکاری احکام کے ذریعہ انگریزی دان لوگوں کو مُلازمت میں ترجیح دی جانے لگی اور مشنری سکول کے مقابلے میں قومی تعلیمی ادارے ہر سطح پر سرد مہری کا شکار ہونے لگے تو ایک طرف مقامی زبانیں جاننے والوں میں بے روزگاری پھیل گئی، دوسری طرف لوگوں کو یقین ہو گیا کہ انگریزی زبان ہی مغربی تہذیب اور عیسائیت کے فروغ کا سبب ہے۔

اس خیال کو حکومت کے طرزِ عمل سے زیادہ اُس مخصوص طبقے کے طور طریق نے تقویت بخشی جو انگریزوں کی آمد سے لے کر آج تک برِّصغیر میں موجود ہے۔ "انگریزیت" کو سب سے پہلے دل و جان سے قبول کرنے والا یہ گروہ قومی، سماجی یا انفرادیت کے جذبات سے ناآشنا تھا۔ اُس کے پیشِ نظر صرف ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح ہم چشموں میں اپنی برتری قائم رکھ سکے۔ جب اس نے "انگریز" اور "انگریزیت" سے ناآشنا عوام کو مرعوب ہوتے دیکھا تو خود بھی اپنی زبان، ماحول، رہن سہن اور لباس پر انگریزی خول چڑھا لیا۔ اس سمجھوتے کے عوض اس کو انگریز کے زیرِ سایہ پھلنے پھولنے والے ماحول میں سب سے اُونچی کرسی ملی۔ اس گروہ نے ذمّہ دار عہدوں پر فائز ہونے کے بعد قومی و ملکی تقاضوں اور مفاد کو نظرانداز کر کے انگریزی تسلّط کے

استحکام کے لیے کام کیا۔

یہ لوگ دل سے انگریزوں کے بہی خواہ ہوں یا نہ ہوں، مگر جنگِ آزادی سے پہلے "انگریزیت" کو اور جنگِ آزادی کے دوران میں "انگریز" کو اسی طبقے نے اپنے آغوش میں جگہ دی۔ اور جب متوسط طبقہ بھی اس گروہ کی پیروی کرنے لگا تو عوام کو یقین ہو گیا کہ انگریزی زبان اور نئی تہذیب کا ہاتھ اُن کے گریبان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

(۱۳) وقتاً فوقتاً ایسے قوانین بنتے رہے جو براہ راست عوام کے جذبات کو مشتعل کرتے تھے، مگر ان کے خلاف آواز اُٹھانا قانوناً جرم تھا۔ مثلاً قید خانوں میں مٹی کے ظروف کا استعمال، جسے اہلِ ہنود نے اپنے مذہبی معاملات میں بے جا مداخلت قرار دیا۔ یا آبائی جائداد کی تقسیم کا قانون، جس کی رو سے مذہب تبدیل کرنے پر بھی ہر شخص باپ دادا کی جائداد سے اپنا حصّہ پا سکتا تھا۔ یہ بات دونوں مقامی فرقوں کی دل آزاری اور بے چینی کا سبب بنی۔ اسی طرح بیوہ کی شادی کا قانون بنا تو ہندوؤں کو بے حد ناگوار گزرا۔ ان کے یہاں بیوہ کو شادی کرنے کا حق نہ تھا۔ اس قانون کے بننے سے ہندو بیواؤں میں پُرانے سماج سے بغاوت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ دراصل انگریز حکّام ہندوستان کو نہایت پس ماندہ، جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا اور قابلِ اصلاح رسوم کا شکار ملک سمجھتے تھے۔ بزعمِ خویش اصلاح کے شوق میں انھوں نے اتنی جلد بازی سے کام لیا کہ عوام اُن کے ہر فعل کو اپنے ذاتی معاملات میں بے جا مداخلت پر محمول کرنے لگے۔

(۱۴) انگریزی تسلّط کی جڑیں مضبوط ہوئیں تو سُود خور مہاجنوں، زمینداروں اور

ذخیرہ اندوز ساہو کاروں کو حکومت کا تحفظ حاصل ہو گیا۔ اب انھوں نے پُر پُرزے نکالے اور قانون کے زیرِ سایہ بے جھجک عوام کو لُوٹنے اور دولت سمیٹنے کے لیے ان پر تشدّد کرنے لگے۔ چونکہ ان کی تمام کارروائیاں انگریزی قانون کے دائرے میں ہوتی تھیں، اس لیے مظلوم کی فریاد سُننے والا کوئی نہ تھا۔ اس طرح انگریزی قانون سے واسطہ پڑنے کے بعد عوام کو پہلی بار احساس ہُوا کہ انگریز کا "قانون" لاقانونیت سے زیادہ مضرّت رساں ہے۔ پہلے گھریلو صنعتوں کا زور تھا۔ دولت مُلک بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ سابقہ نظام میں جاگیرداروں اور نوّابوں کے پاس نقد سرمایہ کم اور جائداد کی مستقل آمدنی زیادہ ہوتی تھی۔ نقد دولت عوام میں بکھری ہوئی تھی۔ انگریزی قوانین نافذ ہوتے ہی سرمایہ گھر گھر سے نکل کر گنتی کے چند ہاتھوں میں پہنچنے لگا۔ جن لوگوں کے پاس پہلے تھوڑی بہت دولت تھی، وہ دیکھتے دیکھتے نفع اندوزی کے ذریعہ امیر ہو گئے۔ اس کے برعکس ہُنر مند طبقہ نانِ شبینہ کو محتاج ہو گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطالبات، انگریز حکّام کی رشوت اور انگریزی افواج کا خرچ بڑھا تو دیسی رئیسوں نے اپنے اپنے علاقے میں لگان بڑھا دیا۔ اس طرح عوام میں ناراضی پھیل گئی اور وہ اپنے تمام مصائب کا سبب انگریزی اقتدار کو قرار دینے لگے۔ فاقہ زدہ کسان اور مزدور مجبور ہو کر انگریزی فوج میں بھرتی ہونے لگے اور ملک کی طاقت سمٹ کر انگریزی چھاؤنی میں اور دولت مہاجنوں کی تجوریوں میں پہنچ گئی۔ اب ملک میں صرف پڑھا لکھا ذہین طبقہ رہ گیا تھا جو نہ فوج کے لائق تھا نہ تجارت کے۔ چونکہ ہر ملک میں یہی طبقہ انقلابی تحریکوں کی راہنمائی کرتا ہے، اس لیے اُسے بے چین اور سراسیمہ کر کے انگریزوں نے اس قیامت کو دعوت دے دی، جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے نام سے مشہور ہے۔

فوج میں بے چینی کے اسباب

فوج میں بے چینی کے اسباب بھی کم وبیش وہی تھے، جن کا ذکر اُوپر کیا جا چکا ہے۔

(۱) انگریز فوجی ہندوستانی فوجیوں کو نہایت کمتر اور حقیر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی فوجیوں میں غیرت اور حمیت کی کمی ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ ہندوستانی فوجوں میں ایسے لوگ بہت کم تھے جو خود سے انگریز کو برتر نہ سمجھتے ہوں، مگر حالات نے اُنھیں انگریزوں سے کمتر بنا دیا تھا۔ انگریز حُکّام اُن کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرتے اور کبھی کبھی اُنھیں گالیاں دینے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔

(۲) انگریزی راج کی بقا میں خود ان کی قوم سے زیادہ ہندوستانی فوجیوں کا حصّہ تھا مگر تنخواہ اور بھتّے کی صُورت میں اُنھیں گورے فوجیوں کا عشر عشیر بھی نہ ملتا تھا۔ اپنی جانبازی کے گیت گاتے گاتے یہ سوچ کر اُن کے سر شرم سے جُھک جاتے کہ وہ ایک جابر قوم کے لیے اپنے ملک کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔

(۳) ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ انگریز حکّام کی بدعہدی کے واقعات اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ کام کے وقت افسر اُن سے مرضی کے مطابق وعدہ کر لیتے، مگر کام نکلتے ہی اپنے وعدے سے منحرف ہو جاتے۔ اس طرح سپاہیوں کی نظر میں حُکّام کا وقار بہت حد تک کم ہو گیا تھا۔

(۴) روز بروز بڑھتی ہوئی گرانی میں انگریز فوجیوں کی تنخواہ، بھتّے اور دیگر سہولتوں میں اضافہ ہوتا رہتا، مگر دیسی سپاہیوں کی فریاد سُننے والا کوئی نہ تھا۔ ایک دفعہ بنگال میں گورے سپاہیوں کو رقم ملنے میں ذرا تاخیر ہوئی تو وہ اپنے ہی ہم قوم، ہم مذہب اور ہم رنگ حُکّام کے خلاف کھڑے ہو گئے، مگر نافرمانی اور حُکم عدولی کی سزا دینے کے بجائے فوراً انعام تقسیم کر کے اُنھیں مطمئن کر دیا گیا۔ اپنے ہم قوموں کے ساتھ اس طرح کے جانبدارانہ سلوک نے دیسی سپاہیوں کی بے چینی میں اضافہ کر دیا۔

(۵) بے انصافیوں اور جانبداریوں کے خلاف اگر کسی گوشے سے آواز اُٹھتی تو اُسے نہایت جابرانہ انداز میں کُچل دیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ اسی طرح کی ایک تحریک کو دبانے کی خاطر انگریز حکّام نے چوبیس ہندوستانی فوجیوں کو گرفتار کر کے مقدّمہ چلایا اور اُنھیں توپ سے اُڑانے کی سزا دی۔ اس فیصلے کے خلاف عام فوجیوں میں نفرت پیدا ہو گئی مگر حُکّام اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ بیس افراد کو توپ سے اُڑا دیا گیا، چار کو دُوسرے طریقے سے سزائے موت دی گئی اور باقی ماندہ فوج سے ہتھیار رکھوا لیے گئے۔

(۶) جس طرح شہری زندگی میں نئے نئے احکام اور قوانین کے ذریعہ

تبدیلیاں لائی جا رہی تھیں۔ اسی طرح فوجیوں کے ردِ عمل کی پروا کیے بغیر ان کے لیے بھی نت نئے جابرانہ احکام صادر ہوتے رہتے تھے۔ یونیفارم پہن کر تلک نہ لگانا، پگڑی کے استعمال پر پابندی اور ڈاڑھی منڈوانے پر زور دینا ہندو اور مسلمانوں دونوں کے مذہبی معاملات میں بے جا دخل اندازی تصور کیا گیا۔

ایسے ہی ایک اور موقع پر گوروں کی فوج کا بھتّہ بند ہوا تو وہ سرکشی پر اُتر آئے اور فوج کی مُلازمت سے استعفا۔ دے دینے کا ارادہ کر لیا۔ حکومت نے اُنھیں سمجھا بُجھا کر مُلازمت جاری رکھنے پر آمادہ کیا اور اُن کے مطالبات منظور کرنے کی صُورت میں جو خرچ بڑھا اُسے ہندوستانی فوجیوں کی تنخواہ سے کاٹ کر، اُن کے عہدے گھٹا کر اور اُن کی ترقی روک کر پُورا کیا گیا۔ ۱۰ جولائی ۱۸۰۶ء کو انھی زیادتیوں کے خلاف مدراس کے علاقہ ویلور میں بغاوت ہوئی تھی۔

۷۔ فوج جب کسی دُور دراز مقام پر بھیجی جاتی تو گورا فوج کے لیے باربرداری کا سامان کمپنی کی طرف سے مہیّا کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس ہندوستانی فوج کو باربرداری کے لیے اپنی جیب سے انتظام کرنا پڑتا تھا بلکہ جہاں گورا اور ہندوستانی سپاہیوں کا ساتھ ہوتا وہاں گوروں کا سامان بھی اُنھیں ہی اُٹھانا پڑتا تھا۔ اس فعل سے اُن کی حمیّت کو بڑی ٹھیس پہنچتی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔

برما کے محاذ پر فوج بھیجی جا رہی تھی۔ اس دُور دراز سفر کے لیے جو

انتظامات ضروری تھے وہ گورا فوج کے لیے کر دیے گئے مگر جب ہندوستانی فوجیوں کا سوال پیش ہُوا تو حکّام نے خاموشی اختیار کر لی۔ فوج کی طرف سے عرضداشت پیش کی گئی کہ ہمارے خرچ پر باربرداری کا انتظام کر دیا جائے (یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے کہ انگریز قوم جو آج اپنی تہذیب اور اپنے ماضی پر فخر کرتی ہے صرف ایک سو سال پہلے اتنی بے حس، بدانتظام اور کم فہم تھی کہ خالص اُس کے مفاد میں کام کرنے والے سپاہیوں کو بھی فوجی ضرورت کی چیزیں اپنی جیب سے خریدنا پڑتی تھیں) اس سفر کے لیے بیلوں کا مہیّا ہونا ضروری تھا۔ سپاہیوں کی اتنی بساط نہ تھی کہ وہ اس خرچ کو برداشت کر سکیں۔ فوج چاہتی تھی کہ انگریز حکّام بیل خرید کر انھیں دے دیں اور اُن کی قیمت تنخواہ سے کاٹ لی جائے۔ مگر حکّام کو یہ خرچ غیر ضروری نظر آیا اور اُنھوں نے حکم دے دیا کہ فوج کو بیلوں کا انتظام خود کرنا چاہیے۔ اس جابرانہ حکم سے اتنی بددلی پھیلی کہ لوگوں نے برما جانے سے انکار کر دیا۔ چونکہ اُن سے سمندر پار جانے کا معاہدہ بھی نہیں ہُوا تھا اس لیے قانونی طور پر وہ حکم عدولی کے مرتکب نہ ہوئے تھے۔

اگر اُس وقت کے انگریز انصاف پسند ہوتے تو فوج کی شکایات کو ہمدردی سے سُنتے اور جائز مطالبات تسلیم کر لیتے۔ مگر اس کے برعکس کمانڈر انچیف ایڈورڈ پیجٹ نے فوج کو آگے بڑھنے یا ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا۔ میدان میں چاروں طرف بھری ہوئی توپیں ایک اشارے کی منتظر تھیں۔ ابھی سپاہی شش و پنج ہی میں تھے کہ توپیں چلا دی گئیں اور بے شمار آدمی اُن کی زد میں آ کر ختم ہو گئے۔ بہت سے مظلوم سپاہیوں نے دریا میں کود کر جان دے دی۔

۸ - ان اسباب کے علاوہ دیسی افواج کے دلوں میں انگریزی تسلّط کے خلاف نفرت پیدا کرنے میں مُسلمان علماء اور ہندو دھرم کے راہنماؤں نے بھی حصّہ لیا۔ مسلمانوں کی مذہبی تنظیمیں اپنے نمائندے فوجوں میں بھیجتی تھیں۔ ادھر ناناصاحب نے اپنے آدمی ایک طرف عوام اور دُوسری طرف فوجی چھاؤنیوں میں بھیس بدل کر بھیجے۔ان عالموں، فقیروں اور سنیاسیوں نے بڑا کام کیا اور دُور و نزدیک کی انگریزی چھاؤنیوں میں جاکر سپاہیوں میں آزادی کی رُوح پھُونک دی۔ ایک برہمن مدراس میں اسی الزام میں گرفتار ہُوا کہ وہ فوجوں کو ورغلا رہا تھا۔ اُس برہمن کو سزا کے طور پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اسی طرح ایک پنڈت علی گڑھ میں پکڑا گیا۔ اُسے پھانسی ہونے لگی تو ایک بے باک سپاہی نے بآوازِ بلند اعلان کیا کہ یہ بہادُر شخص آزادی کی راہ میں شہید ہو رہا ہے۔اس سپاہی کی آواز نے سارے علی گڑھ میں آگ لگا دی۔

عوام کی طرف سے جو لوگ فوجوں میں بھیس بدل کر جاتے تھے، اُن کے لیے خفیہ نشانات بھی تجویز کر لیے گئے تھے۔ ان میں کنول کا پھُول اور چپاتی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بنگال نے پھُول کا نشان اختیار کیا۔ مجاہدین کا نمائندہ ہندوستانی افسروں سے مل کر اُنھیں پھُول پیش کرتا۔ یہ پھُول، جسے خلُوص اور کامیابی کی علامت سمجھا جاتا تھا، افسروں سے ہوتا ہُوا معمولی سپاہی تک پہنچ جاتا۔

دہلی اور یوپی میں پھُول کا کام چپاتی سے لیا گیا۔ یہ چپاتیاں دیہات میں بھیج دی جاتیں۔ انھیں آزادی کا تبرّک اور تحفہ تصوّر کیا جاتا۔ لوگ انھیں آپس میں تقسیم کرکے کھا لیتے اور اپنی طرف سے چپاتیاں پکوا کر دوسری جگہ بھیج دیتے تھے،

اور اس طرح یہ چپاتی جہاں پہنچتی لوگ اسے یگانگت اور وحدت کی علامت سمجھ کر آنکھوں سے لگا لیتے۔

الغرض اسے انگریز حکّام کے جابرانہ سلوک کا ردِّ عمل کہا جائے یا علماء، فقیروں اور سنیاسیوں کی کوشش، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ عوام کے ساتھ ساتھ ہندوستانی افواج میں اپنے آقاؤں کے خلاف بے چینی نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ پنجاب کی سکھ ریاستوں اور باقی ہندوستان کے چند نوابوں اور راجاؤں کے علاوہ ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں انگریز کے خلاف نفرت کا الاؤ نہ سُلگ رہا ہو۔ بعض انگریز مؤرخوں نے لکھا ہے کہ کارتوسوں کی چربی کو بہانہ بنا کر چند شر پسندوں نے انگریزوں کے خلاف فوج کو بھڑکا دیا تھا۔ یہ دعویٰ اپنے اسلاف کی کوتاہیوں کو چھپانے کی ناکام کوشش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود انگریزوں نے نفرت اور سرکشی کے پھونس کو سُکھا سُکھا کر ایسی جگہ ڈھیر کر دیا تھا جہاں اُس میں چنگاری کے گرنے کا احتمال تھا۔ چربی والے کارتوسوں کا واقعہ چنگاری بن کر اُسی ڈھیر پر گرا اور پھونس میں آگ لگ گئی۔

کیا تحریکِ آزادی ناکام تھی ؟

حالات کا سرسری جائزہ لے کر کوئی نتیجہ اخذ کیا جائے تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی قطعی طور پر ناکام ہو گئی تھی۔ حصولِ آزادی کی اس جدّ وجہد میں لاکھوں جانیں گئیں، ہزاروں خاندان برباد ہوئے، قدیم تہذیب و تمدّن، ثقافت اور فنونِ لطیفہ پر تباہی آئی اور ہندوستان کے بعض علاقوں کے لوگ ایسے تتّر بتّر ہوئے کہ چند سال بعد یہ تمیز کرنا مُشکل تھا کہ کون کہاں کا باشندہ ہے۔ ان تمام تباہیوں کے نتیجے میں نہ صرف انگریزی حکومت قائم رہی بلکہ اُس میں اتنا استحکام پیدا ہو گیا کہ انگریز پُورے برِّصغیر پر بلا شرکتِ غیرے حکمرانی کرنے لگے۔ مگر اس بربادی کو تحریک کی ناکامی قرار دینا غلط ہے۔

وہ لاکھوں انسان، جنھوں نے آزادی کے چراغ کو اپنے خُون سے جلایا، بے وجہ نہیں مرے۔ ۱۸۵۷ء کے دردناک واقعات ہی نے دربارِ انگلستان کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبُور کیا کہ ہندوستان کو کمپنی کے جبر و استبداد سے نجات دلا کر پارلیمنٹ کے حوالے کر دیا جائے۔ مجاہدوں اور حریّت پسندوں کا برِّصغیر پر سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ اُنھوں اپنی جانیں دے کر اور گھر بار لُٹا کر اس سرزمین کو

"سرکارِ کمپنی بہادر" کے بے پناہ ظلم و ستم سے نجات دلائی۔

اس میں شک نہیں کہ انگریزوں نے انتہائی تشدد اور طاقت کے بے جا استعمال سے کام لے کر اس طوفان کو عارضی طور پر دبا دیا، مگر اُن کے ہاتھوں برِّصغیر کے جسم پر جو گھاؤ لگے وہ نہ کسی مرہم سے مندمل ہو سکے نہ آپریشن سے۔ اس مُلک کے عوام نے پہلی جنگِ آزادی بندوقوں اور توپوں سے لڑی تھی، شکست کھانے کے بعد وہ بددل نہ ہُوئے۔ دُوسرے دَور میں اُنھوں نے یہ جنگ دماغ سے لڑی اور فتح پائی۔ اگر ۱۸۵۷ء میں لاکھوں انسان غیر مُلکیوں کی بے رحمی کا شکار نہ ہوتے تو انگریز کے خلاف نفرت کی چنگاریاں آنے والی نسلوں کے سینوں میں نہ دہکتیں۔ اگر بیگم حضرت محل، مہارانی جھانسی، بہادر شاہ، بخت خان، محمود خان، مولوی احمد اللہ شاہ، نانا صاحب اور اُن جیسے ہزاروں لاکھوں انسان تاریخِ آزادی کو اپنے خُون سے نہ لکھ جاتے تو بیسویں صدی میں ایسے عالی ہمّت لوگ کہاں پیدا ہوتے، جو برطانیہ کے مُنھ سے ہندوستان کا نوالہ چھین لیتے۔ دراصل اس سے پہلے واقعہ سے لے کر، جس میں کسی دیسی آدمی نے فرنگیوں سے لڑ کر جان دی ہوگی، ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک ایک ہی جنگ تھی، جو مختلف ادوار میں مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں سے لڑی۔ ایک ہی مشعل تھی جسے نئے نئے سرفروش اُٹھا کر آگے بڑھتے رہے۔ اس قطرے پر جو کچھ گزری اُسے گُہر بن جانے کے بعد ناکامی نہیں کہا جا سکتا۔

بایں ہمہ اس تاریخی حقیقت سے اِنکار بھی ممکن نہیں کہ جس چراغ نے سو سال بعد آزادی کے شبستان کو روشن کیا، وہ ۱۸۵۷ء میں دُھندلا پڑ گیا تھا۔

اس المیے کے اسباب تاریخ دانوں کے لیے نئے نہیں۔ عموماً مشرقی اور خصوصاً انحطاط پذیر اسلامی ممالک میں چند مخصوص عناصر جدّ و جہدِ آزادی کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اُس وقت کے ہندوستان میں بھی یہی کچھ پیش آیا۔

سوسائٹی کے اُونچے طبقے میں غدّاروں، مفاد پرستوں اور انگریز ایجنٹوں کی اکثریت تھی۔ چونکہ وہی لوگ ملک کے سیاہ و سفید پر اثرانداز ہوتے تھے اس لیے ان کی سرگرمیوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ انگریزی حکومت کے زیرِ سایہ عیش و آرام کی زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ اُن کے اندر کسی قسم کا قومی، ملّی یا مذہبی جذبہ نہ تھا۔ چنانچہ پچھلی صدی کے ہندوستان میں جہاں جہاں آزادی کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں، وہاں یہ طبقہ اُنھیں دبانے کی کوشش میں سرگرم دکھائی دیتا ہے۔

دوسرے درجے کے لوگوں میں ایسے افراد بھی موجود تھے جن کے قومی جذبات سوئے ہوئے تھے۔ یہ طبقہ حق و باطل کی جنگ میں قطعی غیر جانبدار ہو گیا اور خاموشی میں عافیت سمجھتا رہا۔ باقی لوگ اگرچہ دل سے حق کی فتح چاہتے تھے مگر اس سلسلے میں کچھ کہتے یا کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔

انگریزوں کے مقابلے میں اب صرف ایسے سرپھرے، جرأت مند اور بے باک لوگ رہ گئے تھے جن کے سینوں میں آزادی کی شمع روشن تھی مگر اُن کے وسائل محدود تھے۔ اُن کے پاس نہ انگریزوں کا سا بہترین سامانِ جنگ تھا، نہ تربیت یافتہ فوجیں تھیں۔ پھر وہ ملک بھر میں بکھرے ہوئے تھے۔ مواصلاتی نظام اور خاص خاص شاہراہوں پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ اگر وہ سرفروش منظّم ہوتے تو مٹھی بھر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں دیر نہ لگتی۔ جہاں بہتر

تنظیم تھی وہاں قیادت کا فقدان تھا۔ جہاں مضبوط قیادت تھی وہاں اندرونی انتشار، باہمی رقابت اور سازشی ماحول نے اُسے پنپنے نہ دیا۔ اس افراتفری، بدنظمی اور انتشار کے باوجود اگر ہندوستان کے بعض صوبے، ریاستیں اور قومیں انگریزوں کا ساتھ دینے کے بجائے صرف غیر جانبدار رہتیں تو کوئی وجہ نہ تھی کہ آزادی کا سورج نوّے سال بعد طلوع ہوتا۔

جنگِ آزادی کے فروزاں چراغ

جنرل

بخت خان
عظیم اللہ خان
محمود خان
نانا راؤ پیشوا

علما

مولانا لیاقت علی
مولانا سرفراز علی
مولانا احمد اللہ شاہ
مولانا امیر علی شاہ
مولانا سکندر شاہ فیض آبادی
مولانا قاسم داناپوری

علما

مولانا غلام امام شہید
مولانا عنایت احمد کاکوروی
مولانا حاجی امداد اللہ
مولانا فیض احمد عثمانی
مولانا قاضی فیض اللہ دہلوی
مولانا گلزار علی امروہوی
مولانا شاہ عبدالجلیل
مولانا سید نیاز احمد شہید
مولانا رضی اللہ بدایونی
مولانا سید اکبر زماں
مولانا فضل حق خیرآبادی

والیانِ ملک	دیگر نامور لوگ
بہادر شاہ ظفر	شیخ بلاقی
بیگم حضرت محل	سردار بیگ
رانی لکشمی بائی	رائے سنگھ
ڈھونڈوپنت نانا	عیوض علی
تانتیا ٹوپے	غوث محمّد
شہزادہ فیروز شاہ	الٰہی بخش
نواب علی بہادر خان	قاضی وصی الدین
	آغا میر علی شاہ

دیگر نامور لوگ	
احمد خان کھرل	راجا کنور سنگھ
راؤ طولا رام	ممّو خان
شمس الدین خان	منگل پانڈے
	نوّاب تفضل حسین
	ایشوری پانڈے

یہ فہرست بہت طویل ہے اس لیے صرف زیادہ معروف لوگوں کے نام دے دیے گئے ہیں۔

جہاں تک عُلما کا تعلق ہے، اُنھیں انگریزوں سے نہ کسی قسم کی شکایت تھی، نہ اُنھیں کوئی مالی یا جانی نقصان پہنچا تھا۔ مگر محض جذبۂ حریّت و ایمان اُنھیں گھروں سے نکال کر میدانِ جنگ میں لے آیا۔ دراصل اُن کے سینوں

میں بھی وہی آگ بھڑک رہی تھی جو حیدر علی ، سلطان ٹیپو ، سراج الدولہ اور سیّد احمد بریلوی نے روشن کی تھی ۔ اگر یہ لوگ حق و باطل کے اس معرکے میں غیر جانبدار بھی رہنا پسند کر لیتے تو انگریزوں کی طرف سے ان پر انعام و اکرام کی بارش ہو جاتی ۔

ان بہادروں میں جنھوں نے اُس تاریک دَور میں بھی بین الاقوامی سیاسیات اور روابط پر گہری نظر رکھی عظیم اللہ خان کا نام سب سے اُوپر ہے ۔ اُنھوں نے ایک طرف رُوس سے سیاسی رشتہ جوڑنے کی کوشش کی ، دُوسری طرف مصر اور ترکی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ۔

نانا تیا ٹوپے کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ وہ جوگی کا بھیس بدل کر فوجوں میں گھُس گیا اور سپاہیوں کو انگریزوں کے خلاف بھڑکاتا رہا ۔

جنگِ آزادی کی ابتدا

برسوں سے جمع ہونے والے پھونس کو جس چنگاری کا انتظار تھا وہ ناعاقبت اندیش حکّام نے خود ہی مہیا کر دی۔

۱۸۵۶ء کے اواخر میں پرانی بندوقوں کی بجائے نئی انفیلڈ رائفل استعمال کرنے کا حکم نافذ ہوا۔ اس نئی بندوق کے استعمال کا طریقہ سمجھانے کے لیے ڈم ڈم، سیالکوٹ اور انبالہ میں تربیت گاہیں قائم کر دی گئیں۔ کارتوس اگرچہ فورٹ ولیم میں تیار کر کے تقسیم کر دیے گئے تھے مگر ان کی بڑی تعداد انگلستان سے بھی آئی تھی۔ باہر سے درآمد کردہ کارتوسوں کے لیے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ وہ صرف گوروں کے لیے منگائے گئے ہیں۔ ہندوستانی فوجیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ باہر سے آئے ہوئے کارتوسوں میں گائے اور سوٗر کی چربی استعمال کی گئی ہے تو وہ دیسی کارتوسوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ چونکہ ان کارتوسوں کو استعمال سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا اس لیے یہ بات آگ کی طرح تمام چھاؤنیوں میں پھیل گئی کہ ہندو اور مسلمان سپاہیوں کو گائے اور سوٗر کی چربی لگے

ہوئے کارتوس دانتوں سے کاٹنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

برِّصغیر کے عوام میں ہمیشہ یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ ہر قسم کا ظلم و جور برداشت کر سکتے ہیں لیکن اپنے مذہبی معاملات میں کسی طرح کی مداخلت اُنھیں گوارا نہیں۔ تعجّب ہے کہ آج کی مہذّب، تعلیم یافتہ اور روشن خیال قوم اُس وقت اِس نکتے کو سمجھ نہ پائی۔ چربی لگے ہوئے کارتوسوں کے استعمال کا جو کچھ ردِّ عمل ہُوا، اگر اسے بروقت محسوس کر کے اُس کا تدارک کر دیا جاتا تو بات اتنی جلد نہ بگڑتی۔ مگر انگریز حُکّام نے عوام کے مطالبے کے سامنے جُھکنا سیکھا ہی نہ تھا۔ اقتدار کے نشے نے اُنھیں اتنا مست کر دیا تھا کہ وہ عوام کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ سول اور فوجی حُکّام کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چُکی تھی کہ محکوم ہونے کی حیثیت سے عوام اور فوج اُن کا جائز یا ناجائز حُکم ماننے کی پابند ہے، خواہ اس حُکم سے اُن کے مذہبی جذبہ کو ٹھیس پہنچے یا سینکڑوں برس کے جمے جمائے سماجی ڈھانچے کو ضرب لگے۔ وہ حکم نافذ کرنے سے پہلے یہ یقین کر لیتے تھے کہ اس کی ہر حالت میں تعمیل ہوگی۔

بے چینی بڑھنے لگی تو چند ہوش مند افسروں کی سفارش پر حُکم جاری کر دیا گیا کہ کارتوسوں پر لگنے والی چربی کا انتظام سپاہی خود ہی کر لیں۔ بدقسمتی سے اس حکم پر عملدر آمد نہ ہو سکا کیونکہ افسروں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اس طرح سپاہی یقین کر لیں گے کہ اب تک وہ ناپاک چیز کا استعمال کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ جگہ جگہ اس بے چینی کو طاقت کے ذریعہ دبانے کی کوشش کی گئی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے بہرام پور میں ۲۶ فروری ۱۸۵۷ء کو کارتوس لینے سے انکار کا واقعہ پیش آیا۔ یہاں ایک ضدی افسر کرنل مچل نے معمولی بات کو اپنی احمقانہ روش سے بڑھادیا۔ اُس نے مضطرب اور بے چین فوجیوں کو دھمکی دی کہ جو سپاہی کارتوسوں کے معاملے میں نافرمانی کا مرتکب ہوگا اُسے چین اور برما کے محاذ پر بھیج دیا جائے گا۔ ہندوستانی سپاہیوں کے لیے ان محاذوں پر روانگی کسی بڑی سزا سے کم نہ تھی اس لیے وہ غیر مُلکی حُکّام سے اور بھی بدظن ہو گئے۔ نیز اس طرح اُنھیں چربی کی آمیزش کا بھی یقین ہو گیا۔

فوج میں بغاوت کے آثار پیدا ہونے لگے تو کرنل نے رجمنٹ توڑنے کا حُکم دے دیا۔ اور ان کی جگہ رنگون سے گورا فوج بُلا لی گئی۔ اس حرکت نے ہندوستانی سپاہیوں کے دل میں آگ لگا دی اور وہ کھُل کر مقابلے پر آ گئے۔

۳۱ مارچ ۱۸۵۷ء کو ۱۹ رجمنٹ بارک پور پہنچی۔ اس رجمنٹ میں منگل پانڈے ایک برہمن سپاہی تھا۔ اُس نے جذبات سے بے قابُو ہو کر سارجنٹ میجر کو گولی ماردی۔ یہ اطلاع سُن کر لیفٹیننٹ وہاں پہنچا۔ پانڈے نے اُس پر بھی گولی چلادی۔ اگر ایک مُسلمان سپاہی شیخ پلٹو جُرأت سے کام لے کر پانڈے کو نہ پکڑ لیتا تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ اُس وقت جنرل ہیرسی نے بڑی بہادری دکھائی۔ چند سپاہیوں نے اُسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ خود موقع واردات پر پہنچ گیا اور معاملے کو وقتی طور پر

دبا دیا۔ منگل پانڈے نے جب دیکھا کہ اُس کے ساتھی گونگو کے عالم میں کھڑے ہیں اور اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں تو اُس نے بددل ہوکر اپنے اُوپر گولی چلائی اور زخمی ہوکر گر پڑا۔

۶ راپریل کو دیسی افسران پر مشتمل ایک عدالت میں پانڈے کا مقدمہ پیش ہُوا۔ فوجی عدالت سے پھانسی کی سزا کا حُکم ہُوا اور ۷ راپریل کو یہ جانباز بڑی بہادری سے پھانسی پا گیا۔ اُس کا نام صفِ اوّل کے جانبازوں میں لیا جاتا ہے کیونکہ اُس نے حُکّام کے بے حد اصرار کے باوجود اپنے ساتھیوں کا نام نہ بتایا اور ہنستے ہوئے موت کو لبّیک کہا۔

ایشوری پانڈے اس محاذ کا دُوسرا جانباز تھا۔ جب منگل پانڈے بھری بندوق لیے ہوئے آپے سے باہر ہوگیا اور اُس نے سارجنٹ میجر پر گولی چلا دی تو کچھ سپاہی اُسے پکڑنے کے لیے دوڑ پڑے مگر ایشوری پانڈے نے اُنھیں منگل پانڈے کو پکڑنے سے روکا اور خود بھی اس طرح کی کوشش نہ کی۔ صرف اسی جُرم کی پاداش میں اُسے ۱۲ راپریل کو پھانسی دے دی گئی۔

یہ دو واقعات انگریزوں کی نظر میں کتنے ہی معمولی ہوں مگر درحقیقت یہ بارُود کے اُس ڈھیر میں پہلی چنگاری تھی جس کا دھماکا مئی میں ہونے والا تھا۔

شہر شہر اور بستی بستی

میرٹھ

اپریل کا آغاز ہی انگریزوں کے لیے ناسازگار حالات سے ہُوا۔ حریت پسند غیر ملکی حکمرانوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے خفیہ تحریکیں چلا رہے تھے۔ عُلما اور برہمن اپنے اپنے پیروؤں کو انگریزوں کے خلاف تلوار اُٹھانے پر آمادہ کر رہے تھے۔ دیسی حُکمران اور عوام سب پر ایک خاص قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ شہری آبادی کی بے چینی کی اطلاعات جب فوجیوں تک پہنچتیں تو خود کو وہ ان حالات کا ذمّہ دار سمجھتے، کیونکہ وہی پیٹ کی خاطر ایک غیر قوم کے لیے اپنے ہم وطنوں سے لڑتے رہے تھے۔ اس کے بعد جب بھی موقع ملتا، فوجی اکٹھے ہو کر عہد کرتے کہ وہ انگریزوں سے نجات حاصل کر کے رہیں گے۔

اُس زمانے میں میرٹھ کی چھاؤنی، جو پانچ میل کے رقبے میں پھیلی تھی، بہت مستحکم اور بڑی تھی۔ غیر ممکن تھا کہ یہ چھاؤنی اُن حالات سے متاثر نہ ہوتی جو اِردگرد کے علاقوں میں ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں بھی انگریزوں پر سے دیسی سپاہ کا اور دیسی سپاہ پر سے انگریزوں کا اعتماد اُٹھنے لگا۔ ادھر

تو دیسی سپاہیوں کے دل میں سرکشی کی آگ سُلگ رہی تھی، اُدھر ایک ناعاقبت اندیش افسر کرنل سمتھ نے ۲۴ اپریل کو پریڈ کا حکم دے دیا۔ سپاہیوں کو بتایا گیا کہ کارتوسوں کا استعمال سکھانے کے لیے اس پریڈ کا اہتمام کیا گیا ہے۔

حوالدار میجر نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے افسران کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر کرنل صاحب اپنی ضد پہ اَڑے رہے۔

چنانچہ ۲۴ اپریل کو پریڈ ہوئی۔ نوّے آدمیوں میں سے صرف پانچ نے کارتوس لے لیے اور باقی پچاسی آدمیوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب تک تمام سپاہی کارتوس لینے پہ آمادہ نہ ہوں گے وہ انھیں ہاتھ بھی نہ لگائیں گے۔

چونکہ سپاہی ابھی کھُل کر بغاوت کرنے کے لیے تیار نہ تھے اس لیے اُنھوں نے افسروں کو مطمئن کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کی کہ کارتوس لے لینے کی صُورت میں وہ پُوری فوج کی نظروں میں گر جائیں گے۔

کرنل سمتھ نے اب بھی موقع کی نزاکت کو محسُوس نہ کیا بلکہ اتنی بڑی جمعیت کی طرف سے حکم عدولی دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا اور غصّے میں اُن سب پر مقدمہ چلانے کا اعلان کر دیا۔ ان پچاسی آدمیوں میں تقریباً پچاس مسلمان اور باقی ہندو تھے۔ اس واقعہ کی اطلاع آناً فاناً ارد گرد کی تمام چھاؤنیوں میں پہنچ گئی۔ اور سپاہیوں میں اتنا اشتعال پھیلا کہ اُنھوں نے برج موہن کے گھر کو آگ لگا دی جو کارتوس قبول کرنے والے پانچ آدمیوں کا سرغنہ تھا۔

پچاسی آدمیوں کی حُکم عدُولی نے باقی تمام سپاہیوں کو بھی بھڑکا دیا۔ بلا شُبہہ دیسی سپاہ کی نظر میں اُن پچاسی آدمیوں کی عزّت دوبالا ہو گئی۔ مگر

اُنھیں اپنا انجام صاف نظر آرہا تھا۔ اب اُن کے لیے دو ہی سزائیں ہو سکتی تھیں۔ نوکری سے برطرفی اور قید بامُشقت یا موت۔

غرض ان پچاسی آدمیوں پر مقدمہ چلا۔ فوجی عدالت میں حسب دستور دیسی افسران تھے تاکہ عدالت کے فیصلے کی ذمّہ داری انگریزوں پر عائد نہ ہو۔ دیسی افسروں کی عدالت نے ملزموں کو دس دس سال قید بامُشقّت کا حکم سُنا دیا۔ افسرانِ بالا نے اس کی توثیق کر دی اور ۹ مئی کا دن سزا کے نفاذ کے لیے مقرّر ہو گیا۔

اُس زمانے میں انگریز اپنے فوجیوں کو آئے دِن اس طرح کی جابرانہ سزائیں دیتے رہتے تھے۔ مگر اس سزا کی زیادہ مشتہری نہ کی جاتی تو بات زیادہ نہ بگڑتی۔ مگر حُکّام نے سزا کو ڈرامے کی شکل دے کر اپنے وقار کے تابُوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ سزا کے لیے باقاعدہ ایک تقریب کا انعقاد ہُوا۔ مجرُموں کو پا بہ جولاں میدان میں لایا گیا۔ فوج کے سامنے ان کی وردیاں اُتاری گئیں اور بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ باقی فوج کی مزاحمت کے ڈر سے میدان میں ہر طرف توپیں نصب کر دی گئیں۔ جن سپاہیوں نے ایک غیر ملکی حکومت قائم کرنے کے لیے اپنے بھائیوں کا خون بہایا تھا اُن کے ساتھ یہ بہیمانہ سلُوک نہایت ذِلّت آمیز تھا۔

انجام وہی ہُوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ باقی فوج کے سپاہیوں نے اس طرح اپنے ساتھیوں کی تحقیر ہوتے دیکھی تو اُن کا خون کھولنے لگا۔ وہ اتنے بے حمیّت نہ تھے کہ اپنے پچاسی ساتھیوں کو صرف اس جرُم کی پاداش میں سزا بھگتنے کے

لیے چھوڑ دیتے کہ اُنھوں نے مذہبی معاملات میں اجنبی قوم کی مداخلت کو برداشت نہ کیا تھا اور سب سے آگے بڑھ کر پُوری فوج کے جذبات کی ترجمانی کی تھی۔

تحقیر اور تذلیل کے اس تماشے کے بعد ہندوستانی فوجی آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے اور سب نے متحد ہو کر اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کا عہد کر لیا۔ رہی سہی کسر عورتوں نے پُوری کر دی۔ اُنھوں نے مردوں کو بے غیرت بتایا اور یہاں تک کہہ دیا کہ وہ چوڑیاں پہن کر گھروں میں بیٹھیں اور عورتوں کو میدان میں نکلنے کا موقع دیں۔ جو لوگ اب تک تذبذب میں تھے وہ یہ لعن طعن سُن کر مشتعل ہو گئے اور سب نے مل کر قسم کھائی کہ اپنے ساتھیوں کو چھڑا کر دم لیں گے۔ اس پروگرام پر عملدرآمد کے لیے ۱۰ مئی کی شام کا وقت مقرر ہُوا کیونکہ اُس وقت تمام انگریز گرجا میں ہوتے تھے۔

مقرّرہ وقت پر گرجا کا گھنٹا بجتے ہی دیسی فوج نے جیل کا دروازہ توڑ کر تمام قیدیوں کو چھڑا لیا۔ اُن کی اس کوشش میں جن انگریزوں نے مزاحمت کی وہ مارے گئے۔ حرّیت پسندوں نے اپنے پچاسی ساتھیوں کے ساتھ ساتھ چودہ سو دیگر قیدیوں کو بھی رہائی دلادی۔ وہ سب بھاگ کر شہریوں سے مل گئے۔ اب دیسی سپاہیوں نے دہلی کی طرف کوچ کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ لوگ میرٹھ میں بالکل غیر محفوظ تھے۔ اور انھیں یہ بھی خطرہ تھا کہ اطلاع ملتے ہی گوروں کی منظّم اور مسلّح فوج اُن سے انتقام لینے کے لیے پہنچ جائے گی۔ میرٹھ کا یہ واقعہ کسی منظّم تحریک کا نتیجہ نہ تھا اس لیے اس واقعے سے تعلّق رکھنے والے تمام دیسی سپاہی نہایت غیر منظّم، بے ترتیب اور بکھرے ہوئے تھے۔ مضبوط

قیادت کے جھنڈے تلے جمع ہونا وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ مگر بد قسمتی سے لشکر میں کوئی ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا سردار کہہ سکتے۔ لہٰذا سب کی نظریں شہنشاہِ دہلی کی طرف تھیں اور وقت ضائع کیے بغیر وہ فوراً دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

چند گھنٹے کی اس کارروائی میں لوٹ کھسوٹ کرنے والا وہ طبقہ بھی فوج کے ساتھ ہو گیا تھا جو ہمیشہ ایسے موقعوں کی تاک میں لگا رہتا ہے اور اپنی لاقانونیت کے سبب ہر تحریک کی بدنامی کا باعث بنتا ہے۔ فوج جونہی دہلی کی طرف روانہ ہوئی، اس تخریب پسند گروہ نے میرٹھ میں اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔
انگریزوں نے نہایت مستعدی سے اہم مقامات کا انتظام سنبھال لیا۔ خزانے کی حفاظت کے لیے گوروں کا ایک دستہ مقرر کر دیا۔ کچھ انگریزوں کو باغیوں کی تلاش میں بھیجا گیا، مگر وہ ایک باغی کو بھی پکڑ نہ سکے۔ اسی رات کو انگریزوں کے بنگلوں کو آگ لگا دی گئی۔ بہت سے انگریز لڑتے بھڑتے ان ہنگاموں میں مارے گئے۔

میرٹھ کے ہنگامے میں جہاں انگریزوں کے قتل، لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات ملتے ہیں، وہاں مقامی لوگوں کی انسان دوستی اور ہمدردی کی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں۔ بعض مہذّب شہریوں نے انگریز عورتوں اور بچّوں کی جان بچانے کی خاطر اپنی جانوں کی بازی لگا دی۔ گلاب خان جمعدار نے کمشنر کے پورے خاندان کو بچا لیا۔ اسی طرح ایک چوکیدار بختاور اور نفیسن نامی آیا نے کپتان میکڈونلڈ کے بچّوں کی حفاظت کی۔ چند دیسی سواروں نے ایک انگریز

عورت کی جان بچائی۔ ایک نامعلوم شخص ۲۱ مئی کو میرٹھ میں آیا۔ اُس کے پاس ایک انگریز بچّہ تھا جسے اُس نے دریا میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ راستے میں اُس بچّے کی حفاظت کرتے ہوئے اُس شخص نے بڑی تکلیفیں اُٹھائی تھیں۔ مگر اُس نے ہمّت نہ ہاری اور میرٹھ پہنچ کر بچّے کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ افسران نے اُسے انعام دینے کی بہت کوشش کی مگر اُس نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اس رقم سے غریبوں کے لیے ایک کنواں بنا دیا جائے۔

آگرہ

میرٹھ کے واقعات کی اطلاع ۱۱ مئی کو آگرے پہنچی۔ گورنر جان کولون نے سرکردہ انگریزوں کے مشورے سے فیصلہ کیا کہ ہندوستانی فوجیوں سے ہتھیار واپس لے لیے جائیں اور اُنھیں قلعہ سے نکال دیا جائے۔ کولون میں خود اعتمادی کی کمی تھی۔ اُس نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے ایک طرف بھرت پور اور گوالیار سے جاٹوں اور مرہٹوں کی فوجی امداد حاصل کر لی، دوسری طرف ہتھیار ڈالنے اور معافی مانگنے والے فوجیوں کو کچھ رعایات دینے کا اعلان کر دیا۔ اس کوشش کا خاطر خواہ نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی گورنر جنرل نے اس اعلان کو منسوخ کر دیا اور دُوسرے اعلان کی رُو سے عام معافی کی شرائط سخت کر دیں۔ ان متضاد اعلانات نے دیسی افواج کو سرکشی پر مجبور کر دیا۔

۲ جولائی کو فوج کے کنٹنجنٹ کو، جس میں سوار پیادے اور توپ خانہ شامل تھا، چھاؤنی میں آنے کا حکم دیا گیا۔ یہ فوج ۴ جولائی کو باغی ہو گئی اور انگریز عورتوں اور بچّوں کو قلعہ میں پناہ لینا پڑی۔

نواب سیف اللہ خان اور راجا کوٹا نے انگریزوں کی مدد کے لیے ایک ایک فوجی دستہ بھیجا تھا، مگر وہ دونوں بھی باغی ہو گئے۔ اُس وقت کولون بیمار تھا۔ اُسی حالت میں وہ ایک مختصر سی فوج لے کر حرّیت پسندوں سے لڑنے نکل کھڑا ہُوا۔ اس مقابلے میں انگریزوں کو شکست فاش ہوئی۔ میدان جنگ میں اُن کا بہت جانی نقصان ہُوا اور وہ پسپا ہو کر قلعہ کی طرف بھاگنے لگے۔ حرّیت پسندوں نے تمام راستے اُن تعاقب کیا اور اتنی چابکدستی اور تجربہ کاری سے گولہ باری کی کہ انگریز فوج کو بھاگتے بھی نہ بن پڑی۔ اس طرح انگریزوں کی عملداری قلعہ تک محدود ہو گئی اور شہر اُن کے تسلط سے آزاد ہو گیا۔ اس کے بعد حریت پسندوں نے چھاؤنی کو آگ لگا دی۔

گوالیار یہاں ۲۷ مئی ہی کو ہنگامے کی علامات ظاہر ہونے لگی تھیں۔ کئی دن تک انگریزوں کو اطّلاعات ملتی رہیں کہ ان کے خلاف سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور لوگ ان کی جان کے درپے ہیں۔

۱۴ر جون کو چھاؤنی کے درمیان ایک بنگلے میں آگ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد دو تین بنگلے جل کر راکھ کا ڈھیر ہو چکے تھے۔ نو بجے شب توپ چلنے کی آواز آئی۔ اس آواز نے انگریزوں میں ایک دہشت پھیلا دی۔ تمام انگریز مسلح ہو کر باہر نکلے۔ چھاؤنی کی طرف سے مسلسل گولیاں چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہاں بازاروں میں مسلح افراد جمع تھے اور بنگلوں کو آگ لگا رہے تھے۔ بعض انگریز افسران اُسی وقت آگرے کی طرف بھاگ گئے۔ باقی ماندہ انگریز رات کو ایک بجے پھول باغ پہنچ گئے۔ ان سب کو مہاراجا نے اپنی حفاظت میں لے لیا اور دوسرے دن

اپنی فوج کے پہرے میں سب کو آگرے بھیج دیا۔ گوالیار میں بریگیڈیر کا بنگلا بھی لوٹ کر جلا دیا گیا۔

متھرا

متھرا کی فوج نے ۳۰ رمئی کو بغاوت کی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ راجا بھرت پور نے انگریزوں کی مدد کے لیے جو فوج بھیجی تھی، اُس نے بغاوت کر دی اور دیسی افواج سے مل گئی۔

بلند شہر

بلند شہر انگریزوں سے خالی تھا، اس لیے یہاں تشدّد کی کوئی واردات نہ ہوئی۔ خاموشی سے خزانہ لوٹ لیا گیا۔ البتہ گوجروں نے قید خانہ توڑ دیا، سرکاری دفاتر کو نقصان پہنچایا اور کاغذات جلا دیے۔

مُظفّر نگر

مظفّر نگر کا مجسٹریٹ برفورڈ بُزدل تھا۔ اُس نے میرٹھ کے ہنگامے کی خبریں سُنتے ہی سرکاری دفاتر بند کر دیے اور جیل خانے کی گارد کو اپنی ذاتی حفاظت پر مامور کر کے ایک مکان میں خود ہی محصُور ہو گیا۔ یہاں خوب غارت گری ہوئی اور خزانہ بھی لُوٹ لیا گیا۔

علی گڑھ

۲۱ رمئی کو علی گڑھ بھی انگریزوں سے چھِن گیا۔

ایک برہمن کی موت نے علی گڑھ کی پُرسکون فضا میں ہلچل مچا دی۔ یہ برہمن انگریزوں کے خلاف سازش کے جُرم میں گرفتار ہُوا تھا۔ اُسے ۲۰ رمئی کو دیسی فوج کے سامنے پھانسی دی گئی۔ برہمن کی تڑپتی ہوئی لاش کو دیکھ کر ایک جوشیلا جوان بے قابو ہو گیا۔ اور لاش کو پکڑ کر زور سے چیخا ”بھائیو! یہ وہ شخص ہے جس نے دھرم کی خاطر جان دی!“

اس ایک جملے نے سپاہیوں کے دلوں کو گرما دیا۔ وہ طوفان کی طرح اُٹھے اور قید خانہ توڑ کر قیدیوں کو چھڑا لیا، نیز خزانہ بھی لُوٹ لیا۔ علی گڑھ کے لیے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ انتہائی جوش و خروش کے باوجود یہاں لوگوں نے انگریزوں یا عیسائیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

سہارنپور انگریزوں کی نظر میں یہ علاقہ بے حد اہم تھا۔ یہاں انجینئرنگ کالج بھی تھا۔ اگرچہ یہاں دو مرتبہ ہنگامہ ہُوا، مگر مقامی مجسٹریٹ نے تدبّر اور ذہانت کا ثبوت دے کر بگڑتے ہوئے حالات پر قابو پالیا۔

مُرادآباد یہاں ۳ر جُون کو خزانہ لُوٹ لیا گیا اور انگریزوں کے مکانات جلا دیے گئے۔ ۴ر جُون کو کئی انگریز قتل ہو گئے۔ باقی انگریز عورتوں اور بچّوں کو چھوڑ کر نینی تال کی طرف بھاگ گئے۔ نوّاب رامپور نے تمام انگریز عورتوں اور بچّوں کو حفاظت سے رکھا۔ اُن کے لیے خوراک وغیرہ کا انتظام بھی کیا۔ پھر بریلی اور میرٹھ کے کمشنروں کی درخواست پر اپنی فوج کی حفاظت میں میرٹھ بھیج دیا۔

فتح گڑھ بریلی اور شاہجہاں پور کے فسادات کی خبر یہاں ۳۰ر جُون کو پہنچی۔ دیسی فوج (۱۰ رجمنٹ) کے اطوار بتاتے تھے کہ وہ عَلمِ بغاوت بلند کرنے والی ہے۔ چنانچہ انگریز افسروں نے مشورہ کر کے تمام عورتوں اور بچّوں کو ۴ر جولائی کو کانپور بھیج دیا۔ خزانے کا تین لاکھ روپیہ پہلے ہی فوج نے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ ۱۰ رجمنٹ کے افسران بھی ۵ر جولائی کو

کانپور کی طرف فرار ہو گئے۔ چونکہ انگریزوں پر اب ہر گاؤں اور بستی سے حملہ ہوتا تھا، اس لیے وہ جان بوجھ کر منتشر ہو گئے اور ایک ایک دو دو کر کے الگ الگ چل پڑے۔ ان میں سے کچھ لوگ ہردیو بخش زمیندار دھرم پور کے پاس پناہ گزیں ہوئے۔ باقی تقریباً ایک سو چھبیس افراد کانپور پہنچ کر نانا صاحب کی فوج کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ جو لوگ ہردیو بخش کے پاس رہ گئے تھے، اُنھیں بھی حریت پسندوں کے طعنوں اور دھمکیوں سے مجبور ہو کر حراست میں کانپور بھیجنا پڑا۔ یہ سب بھی مختلف اوقات میں قتل ہو گئے۔

رُہتک تقریباً آٹھ سو حریت پسند، جن میں سوار اور پیادے شامل تھے، ۲۴ مئی کو رُہتک پہنچے۔ وہاں کے سپاہی بھی اُن سے مل گئے۔ سب نے خزانہ لوٹا اور جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو آزاد کرایا۔ تھانے دار سمیت تمام انگریز وہاں سے بھاگ گئے۔ فوج نے سارے علاقے پر قبضہ کر کے اعلان کر دیا کہ اب وہاں نواب جھجر کی حکومت ہے۔

اعظم گڑھ یہاں سپاہیوں نے تعاقب کر کے بنارس کی طرف جاتا ہوا خزانہ لوٹ لیا۔ اس میں سات لاکھ روپے تھے۔ انگریزوں نے فوراً اعظم گڑھ خالی کر دیا۔

بنارس انگریزوں نے بنارس کے بگڑتے ہوئے حالات سدھارنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے۔ جب ۳ جون کو اُن کی مدد کے لیے ایک فوج بنارس پہنچ گئی تو کرنل نیل نے ۴ جون کو دیسی فوج سے ہتھیار رکھوانا چاہے۔ اس تقریب کے دوران میں افراتفری پھیل گئی اور دیسی

فوج نے گوروں پر حملہ کر دیا۔ انگریزوں کی مدد کے لیے سکھوں کا ایک دستہ آگیا تھا مگر وہ بھی غلط فہمی کی بنا پر انگریزی توپوں کا نشانہ بن گیا۔

جونپور

انگریزوں کے ہاتھوں سکھ دستے کی تباہی کی داستان جونپور پہنچی تو وہاں سکھ دستے نے بغاوت کر دی۔ خزانہ لوٹ کر انگریزی بنگلوں کو آگ لگا دی گئی۔ قید خانہ توڑ دیا اور انگریز افسروں کو قتل کر دیا۔

گورکھپور

گورکھپور کے حالات بے حد تشویش ناک تھے۔ ۲۸ جون کو نیپال سے گورکھا پلٹن انگریزوں کی مدد کے لیے پہنچ گئی تھی۔ ۲۵ جولائی کو دوسرا گورکھا رسالہ آنے والا تھا مگر اسی دن بغاوت ہو گئی۔ مجبوراً انگریزوں نے گورکھپور خالی کر دیا۔ صرف ایک انگریز کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ باقی تمام انگریز گورکھوں کی حفاظت میں وہاں سے نکل گئے۔

الہ آباد

یہاں ۶ جون کو جدّوجہد کا آغاز ہوا۔ قلعہ تک پہنچتے پہنچتے بہت سے انگریز قتل ہو گئے اور باقی قلعہ میں پناہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ الہ آباد کی اہم شخصیت مولانا لیاقت علی تھے۔ وہ بہت مدبّر اور منتظم شخص تھے۔ انھوں نے شہر کے تمام لوگوں میں یگانگت پیدا کر کے اس محاذ کو مضبوط بنائے رکھا۔

فتح پور

الہ آباد کے لوگوں نے ۹ جون کو کانپور پہنچ کر اپنی تحریک شروع کی۔ حسبِ معمول یہاں بھی خزانہ لوٹا گیا اور قید خانہ توڑ کر قیدیوں کو رہا کرا لیا گیا۔ تمام دفتری ساز و سامان نذرِ آتش کر دیا گیا۔ لوگوں نے عیسائیوں کے تبلیغی اداروں کو بھی آگ لگا دی۔ یہاں سے

تمام انگریز جان بچا کر بھاگ گئے، مگر رابرٹ ٹکر جو یہاں جج تھا، فتح پور چھوڑنے پر تیار نہ ہُوا۔ لوگوں نے اُسے قتل کر دیا۔ فتح پور تحریک کے قائد ایک نیک دل بزرگ دیوان حکمت اللہ تھے۔

باندہ

۸ رجون کو باندے میں ہنگامہ ہُوا۔ وہاں نواب علی بہادُر نے انگریزوں کی حفاظت کی۔ نوّاب بڑا بہادُر اور روشن خیال آدمی تھا۔ ۱۴ رجون کو ہمیر پور میں بغاوت ہوئی۔ کئی انگریز مارے گئے اور کچھ بھاگ کر نوّاب علی بہادُر کے پاس پناہ کی تلاش میں آ گئے۔ نوّاب نے محض انسان دوستی کے جذبہ سے مجبور ہو کر اُن کا تحفظ کیا اور محفوظ مقام پر بھیج دیا۔

کانپور

کانپور کی اہمیّت دوسرے مقامات کی بہ نسبت زیادہ تھی۔ یہاں انگریز فوجیوں اور سول حُکّام کے علاوہ بے شمار سیّاح، تاجر اور صنعت کار رہتے تھے۔ مسیحی تبلیغی جماعتوں کے کارکن اور عام عیسائی بھی بڑی تعداد میں موجُود تھے۔

میرٹھ کے واقعات کی اِطّلاع ملتے ہی سر ہیو وھیلر نے، جو انگریزی چھاؤنی کا افسرِ اعلیٰ تھا، مقابلے کی تمام کارروائیاں مُکمّل کر لیں۔ بیرک کے قریب مورچے بنا لیے گئے۔ ہر چہار طرف سے سنسنی خیز خبریں آ رہی تھیں اور روز بروز دیسی سپاہ کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا مگر کئی دن تک کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ ۲۱ رمئی کو لکھنؤ سے ایک فوجی دستہ انگریزوں کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ وھیلر کو اپنی طاقت اور حکمتِ عملی پر اتنا گھمنڈ تھا کہ اُس نے وہ فوجی دستہ واپس کر دیا۔ اس کی اس حماقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیسی سپاہ کے حوصلے بڑھ گئے۔ صوبیدار ٹیکا سنگھ، رحیم خان

اور مدد علی دیسی فوج کو انگریزوں کے خلاف اُکسانے میں پیش پیش تھے۔
اتفاقاً ۲ر جون کی شب کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے بارُود کے ڈھیر میں آگ لگا دی۔ پہرے کا ایک سپاہی کسی انگریز کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ مگر چونکہ وہ انگریز تھا، اس لیے اُسے شراب کے نشے میں مدہوش ہونے کا فائدہ دیتے ہوئے رہا کر دیا گیا۔ اس جانبداری پر دیسی فوج مشتعل ہو گئی۔ ۴ر جون کو اُنھوں نے خزانہ لُوٹ لیا، شہری چھڑا لیے اور اسلحہ پر قبضہ کر لیا۔ مجبوری کی حالت میں وھیلر نقد روپیہ اور انگریزوں کو لے کر اپنے مورچے میں جا چھُپا۔
ادھر سے مطمئن ہو کر کانپور کی فوج دہلی کی طرف چل پڑی، مگر راستے میں نانا صاحب کی رائے بدل گئی۔ وہ فوج کو لے کر واپس کانپور آیا اور انگریزی فوج کا محاصرہ کر لیا۔ توپوں کی لڑائی جاری رہی۔ انگریزوں نے بھی بہت بہادری سے مقابلہ کیا مگر محاصرہ جتنا طُول کھنچتا گیا، اُن کی حالت خراب ہوتی گئی۔ جب سامانِ جنگ اور رسد ختم ہونے لگی تو مجبوراً ایک انگریز خاتون مسز جیکوبی کے ذریعہ صُلح کی بات چیت شرُوع ہوئی۔ دونوں فریقوں کے درمیان ۲۶ر جون کو ایک مُعاہدہ ہو گیا، جس کی رو سے انگریزوں نے نانا صاحب کو ایک لاکھ روپیہ دیا اور دُوسرے فریق نے تمام انگریزوں کو اپنی حفاظت میں محفوظ مقام پر پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ انگریز عورت، مرد اور بچے سب تقریباً سات سو پچاس افراد تھے۔
نانا صاحب کی طرف سے انگریزوں کی حفاظت کے تمام انتظام کر دیئے گئے۔ سفر کے لیے کشتیاں اور سامانِ خورد و نوش مہیا کر دیا گیا۔ زخمیوں، عورتوں اور بچوں کے لیے گھاٹ تک پہنچنے کے لیے سواری بھی فراہم کر دی گئی۔

جب تمام انگریز کشتیوں میں بیٹھ گئے تو مشتعل فوجیوں نے ان کشتیوں پر گولہ باری کردی۔ اُس وقت وہاں عظیم اللہ خاں، نانا صاحب، راؤ صاحب اور جوالا پرشاد سب موجود تھے مگر اس آتش باری کو کوئی نہ روک سکا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے کے دامن پر بدعہدی کا یہ نہایت بدنما داغ ہے۔ اگرچہ یہ بدترین واقعہ فوج کے اشتعال اور اِنتہا پسندی کا نتیجہ تھا اور اس میں بظاہر تحریک کا کوئی قائد ملوّث نہ تھا، مگر کتنا اچھا ہوتا اگر ان قائدینِ تحریک میں سے کوئی ایک شخص بھی جُرأت کر کے ان مظلوموں کی خاطر اپنی جان پر کھیل جاتا۔ اس طرح تاریخ میں تلوار کی جانبازی کے ساتھ ساتھ کردار کی عظمت کا ایک یہ افسانہ بھی شامل ہو جاتا۔

بہرحال ان انگریزوں میں بہت سے مارے گئے یا ڈوب گئے۔ صرف چار آدمی کسی طرح بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس واقعے کے بعد نانا صاحب کی حکومت کا باقاعدہ اعلان ہو گیا ــــ مگر اُسے حکومت کرنے کا زیادہ موقع نہ ملا۔ جلد ہی انگریزوں نے جوابی حملہ کر دیا اور نانا صاحب شکست کھا کر پہلے اودھ پھر نیپال چلا گیا۔

بریلی

روہیلکھنڈ کے علاقے نے روہیلوں کے دَورِ اقتدار میں بڑی ترقی کی تھی۔ انگریزوں نے اگرچہ والیٔ اودھ کی مدد سے اُن کی عظمت و شوکت کو پیوندِ زمین کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ پھر بھی اس علاقے کے لوگوں کی خصوصیات اور اُن کے مزاج اپنی جگہ پر تھے۔ یہاں کے لوگ نہایت بہادر اور مذہب کے معاملے میں بے حد راسخ العقیدہ تھے۔

اُن میں مذہب کی محبّت والہانہ حد تک پائی جاتی تھی۔ روہیلہ حاکموں میں حافظ رحمت خان کی مقبولیت کا تو یہ عالم تھا کہ انگریزی دَورِ اقتدار میں بھی اُن کے خاندان کو بڑی عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کا پوتا خان بہادُر خان عوام میں بڑا ہر دل عزیز تھا۔ فوج میں صوبیدار بخت خان اور میجر محمد شفیع انگریزوں کے پکّے دشمن تھے اور انھی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ دیسی فوج انگریز حکّام سے برگشتہ ہو گئی تھی۔

سب سے پہلے بریلی میں ۳۱ رمئی کو گیارہ بجے ہنگامہ شرُوع ہُوا۔ انگریز حُکّام عورتوں اور بچّوں کو نینی تال بھیج چکے تھے۔ مجاہدینِ آزادی نے توپوں اور دیگر اسلحہ پر قبضہ کر لیا۔ بریلی چھاؤنی کا بریگیڈیر سیالڈ مارا گیا۔ رفتہ رفتہ تمام انگریز وہاں سے بھاگ کر نینی تال پہنچ گئے۔ کپتان میکنزی نے دیسی افواج کو اپنے ساتھ ملانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اُدھر سے نااُمّید ہو کر بالآخر اُسے بھی میدان چھوڑنا پڑا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بخت خان فوج اور نقد سرمایہ ساتھ لے کر دہلی چلا گیا اور خان بہادُر خان نے روہیلکھنڈ کی حکومت سنبھال لی۔

شاہجہاں پُور شاہجہاں پُور نے ۳۱ رمئی کو غلامی کا جوا اُتار پھینکا۔ تمام انگریز گرجا میں جمع تھے کہ ہنگامہ ہو گیا۔ اُن کی حفاظت کے لیے سکھ فوج موقع پر پہنچ گئی، مگر معمولی مقابلے کے بعد انگریز وہاں سے فرار ہو گئے۔

فرّخ آباد یہاں کسی بڑے واقعے نے جنم نہیں لیا۔ دیسی سپاہیوں نے انگریزوں کا حُکم ماننے سے اِنکار کر دیا اور نوّاب تفضّل حسین کو

اپنا حاکم بنالیا۔ انگریزوں نے یہ حالت دیکھی تو افسرِ اعلیٰ کرنل سمتھ کی سرکردگی میں فتح گڑھ کے قلعے میں چلے گئے۔

دیسی افواج نے ۲۵ر جون کو قلعے پر دھاوا بول دیا جہاں کرنل سمتھ کے علاوہ صرف ایک سو انگریز تھے۔ ان میں بھی ایسے آدمی صرف سینتیس[۳۷] تھے، جو لڑ سکتے تھے۔ تاہم کرنل نے توپیں وغیرہ نصب کرکے مقابلہ کیا۔ اس بہادرانہ مزاحمت میں کئی انگریز مارے گئے۔ مقابلے کا جاری رکھنا مشکل تھا، اس لیے بچے کھچے انگریز ۲ر جولائی کی رات کو کشتیوں کے ذریعے بھاگ نکلے۔ مگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ان میں سے بہت کم کسی محفوظ مقام پر پہنچ سکے۔ کچھ راستے میں ڈوب گئے، کچھ مارے گئے اور کچھ گرفتار ہو گئے۔

جہلم انگریزوں کا خیال تھا کہ ہندوستان سے آتے ہوئے لوگ اس علاقے میں لوگوں کو سرکشی پر اُبھارتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے سب سے پہلے جہلم ڈویژن سے تمام ہندوستانیوں کو نکال دیا۔ مگر اس طرح بھی اس خطّے میں تحریکِ آزادی متاثر نہ ہو سکی۔۔۔ راولپنڈی اور جہلم میں فوجوں نے انگریزوں سے کئی لڑائیاں لڑیں۔ بہت سے آدمی لڑتے ہوئے گرفتار ہوئے یا انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے، مگر اس سے اُن کی مجاہدانہ سرگرمیوں میں کمی واقع نہ ہوئی۔ جہلم کی فوج پر انگریزوں نے بہت ظُلم ڈھائے۔ صرف راولپنڈی میں بارہ افراد کو پھانسی دی گئی اور ۱۳۸۳ حریت پسندوں کو سزائے قید ہوئی۔ جہلم میں ۳۴۵ افراد سزا یاب ہوئے۔

مری یہاں حریت پسندوں کی قیادت ڈاکٹر رسول بخش، سیّد امیر علی اور

سیّد کرم علی کے ہاتھ میں تھی ۔ یہ تینوں حضرات پٹنے کے رہنے والے تھے ۔ سیّد کرم علی گرفتار ہوئے تو اُنھوں نے اعتراف کیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف محاذ بنا رہے تھے ۔ ان تینوں مجاہدوں کو پھانسی دی گئی ۔ یہاں انگریزوں نے انتقاماً کئی دیہات کو آگ لگادی اور فصلوں کو تباہ کر دیا ۔

مُلتان شمالی ہندوستان کے گوشے گوشے میں جب ہر طرف اک آگ لگ رہی تھی تو ملتان کے فوجی اُس کی تپش کو کیونکر محسوس نہ کرتے ۔ انگریزوں نے اُنھیں ۔ ارجون کو غیر مسلح کر دیا ۔ پھر بھی جہلم کے ایک صوبیدار اور آٹھ سپاہیوں کو جب موت کی سزا دی گئی تو یہاں فوج میں اشتعال پھیل گیا ۔ اُسی دن حُکّام نے مُلتان کے چند سپاہیوں کو پکڑ لیا ۔ ان میں سے ایک سپاہی نے وعدہ معاف گواہ بن کر حرّیت پسندوں کے ایک گروہ کو گرفتار کرا دیا ۔ ان میں ایک صوبیدار میجر ناہر خان اور اُس کے دس ساتھی تھے ۔ انگریزوں نے ان لوگوں کے خلاف ثبوت مُہیّا کرنے کے لیے اپنے جاسُوس فوج میں بھیجے ۔ آزادی کی تحریک کے کارکن فوجی اگرچہ اپنے رازوں کی حفاظت جان سے زیادہ کرتے تھے مگر دو افسروں برکت علی اور شہداد خان نے بڑی عیّاری سے انگریزوں کے لیے جاسُوسی کا کام انجام دیا اور تمام حالات کی رپورٹ حُکّامِ بالا کو دے دی ۔

۱۸ ر جولائی کو ناہر خان اور اُس کے ساتھیوں پر مقدمہ چلا اور سب کو سزائے موت دے دی گئی ۔ ان بہادروں نے جس عالی ہمتی سے موت کو خوش آمدید کہا وہ تاریخِ آزادی کا سنہری باب ہے ۔ پھانسی پانے سے ایک رات پہلے

ایک نوجوان سپاہی اپنے عزیزوں کو یاد کر کے آب دیدہ ہو گیا تو اُس سے کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے نائک تیواڑی نے غصّے سے چیخ کر کہا :

"بُزدل ! اگر میں ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے جکڑا نہ ہوتا تو تجھے جان سے مار دیتا۔"

غرض سب نے ہنستے ہوئے جان دے دی۔

جنگِ آزادی کے نامور مجاہدوں کا ذکر کرتے ہوئے احمد خاں کھرل کا نام نہ لینا بڑی بے انصافی ہوگی۔ یہ بہادر شخص جب تک زندہ رہا، نہ خود چین سے بیٹھا نہ انگریزوں کو بیٹھنے دیا۔ ۲۶ جولائی کو گوگیرہ کا قید خانہ توڑ کر قیدیوں کو آزاد کیا۔ پھر دوسرے رئیسوں کی مدد لے کر انگریزوں کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ایک دفعہ سرکاری ڈاک روک کر ملتان اور لاہور کے درمیان رابطہ ختم کر دیا۔ اُس نے اعلان کر دیا تھا کہ ہماری تمام جدّو جہد کا مقصد شہنشاہِ دہلی کی حمایت کرنا ہے۔

احمد خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگل میں تھا کہ تعاقب کرتی ہوئی انگریزی فوج سے مقابلہ ہو گیا۔ اس جنگ میں انگریزی فوج کے رسالدار اور بہت سے آدمی مارے گئے۔ انگریزی فوج پسپا ہو گئی مگر اُنھوں نے دوبارہ شدید حملہ کیا۔ اس مقابلے میں احمد خان اور اس کا بھتیجا شہید ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد بھی احمد خان کے ساتھیوں نے ہتھیار نہ ڈالے اور انگریزوں سے مقابلہ جاری رکھا۔

فیروز پُور

پنجاب کی سکھ ریاستوں نے جنگِ آزادی میں بڑی دیدہ دلیری سے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ان کے علاوہ چند مُسلم ریاستوں اور جاگیرداروں نے بھی جہاں تک ممکن ہوا انگریزی راج کو مدد دی۔ مگر عوام اور فوج میں

انگریزوں کے خلاف بڑی نفرت اور بے چینی پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۹ اپریل یعنی میرٹھ کی بغاوت سے تین ہفتے پہلے ہی انبالے میں انگریزوں کے بنگلوں کو آگ لگائی جا چکی تھی اور فیروز پور میں ۱۳ مئی سے چھوٹے چھوٹے ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔

پنجاب کے علاقے میں فیروز پور فوجی نقطۂ نظر سے بڑا اہم شہر تھا یہاں سامانِ جنگ کا وافر ذخیرہ تھا۔ دیسی افواج میں چربی والے کارتوسوں کے خلاف نفرت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی سپاہی اُسے استعمال کر لیتا تو اُس کے ساتھی اُس کے ساتھ کھانا پینا اور اُٹھنا بیٹھنا بند کر دیتے تھے۔

میرٹھ کے واقعہ کے بعد فیروز پور میں ایک دستے نے میگزین پر حملہ کر دیا۔ میگزین اگرچہ تباہی سے بچ گیا، مگر اس حملے سے چھاؤنی کی عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا۔

لدھیانہ

یہاں ایک مولوی صاحب شہر کی آبادی میں بے حد مقبول تھے۔ خاص و عام اُن کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ باہر کے فوجی اپنے اپنے علاقوں سے ہنگامہ کر کے لدھیانے میں آئے تو یہاں کے لوگ بھی اُن کے ساتھ ہو گئے اور سب اکٹھے ہو کر دہلی کی طرف چل پڑے۔

۷ جون کو حکام نے عام آبادی کو غیر مسلح کر دیا۔ قلعے کے چاروں طرف تین سو گز تک تمام عمارتیں مسمار کر کے تمام علاقہ ویران کر دیا گیا۔

جالندھر

انگریزوں نے کپورتھلہ کے راجا رندھیر سنگھ کی مدد سے جالندھر کی حفاظت کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ سکھوں کو بھرتی کر کے ایک نئی رجمنٹ بنالی گئی تھی مگر ۷ جون کو جالندھر کی فوج نے سرکشی اختیار کی اور چھاؤنی سے نکل گئی۔

ہوشیار پور ہوشیار پور میں ۳ رمئی کو آتش زنی کی شکل میں ایک ہنگامہ ہُوا۔ ڈپٹی کمشنر نے پولیس کی مدد سے انگریز خاندانوں کو محفوظ مقامات پر پہنچا دیا اور خود تحصیل کی عمارت کو مورچہ بنا کر حفاظتی اقدامات کر لیے۔

لاہور میرٹھ اور دُوسرے مقامات کے ہنگاموں کی خبروں نے انگریزوں کو سراسیمہ کر دیا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے فوج کو غیر مسلح کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تجویز پر عملدرآمد کرنے کے لیے راتوں رات گورا فوج اہم مقامات پر متعین کر دی گئی اور میدان کو توپوں سے گھیر لیا گیا۔ اس طرح دیسی فوج بالکل بے دست و پا ہو گئی تو اُسے غیر مسلح کر دیا گیا۔ ادھر سے مطمئن ہو کر قلعے میں کئی ماہ کی خوراک اور سامانِ جنگ بھر لیا گیا اور نئی فوج بھرتی کر کے حفاظتی انتظامات مکمل کر لیے گئے۔

حریت پسند فقیروں اور سنیاسیوں کا بھیس بدل کر چھاؤنیوں اور شہر کے گلی کوچوں میں آزادی کی رُوح پھُونکتے اور عوام کو انگریزوں کے خلاف اُکساتے تھے۔ لہٰذا ایسے تمام لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

دوسری ناقابلِ اعتماد جماعت اُن ہندوستانیوں کی تھی جو روزگار کی تلاش میں پنجاب آ گئے تھے۔ ان کے بارے میں یقین کر لیا گیا تھا کہ تلاشِ روزگار کے بہانے مقامی لوگوں کو ورغلانے کے لیے آتے ہیں۔ چنانچہ پہلے اُس علاقے میں اُن کا داخلہ بند کیا گیا، پھر ڈھائی ہزار افراد کو وہاں سے نکال دیا گیا۔

جُون کے مہینے میں لاہور کی یہ حالت تھی کہ گلی کوچوں میں فوجی عدالتیں قائم تھیں۔ ذرا سے شُبہے پر موت کی سزا دے دی جاتی تھی۔ فوج سے بھاگنے، بغاوت کرنے یا بغاوت پر اُکسانے والوں کو توپ دم کر دیا جاتا۔ آزادی کے لیے لوگوں میں جتنی لگن بڑھتی جاتی، اتنی ہی سزائیں سخت ہوتی جاتی تھیں۔

۳۰ جولائی کو ۲۶ رجمنٹ نے میاں میر چھاؤنی میں عَلمِ بغاوت بلند کر دیا۔ چند انگریز اور دیسی افسروں کو قتل کر کے یہ لوگ گورداسپور کی طرف چلے گئے۔ اس رجمنٹ کے سِکھ سپاہیوں نے اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ وہاں کمشنر نے پہلے ہی حفاظتی انتظامات کر لیے تھے اور خزانہ امرتسر بھیج دیا گیا تھا۔ جب یہ لوگ دریائے راوی کے کنارے پہنچے تو سُلطان نامی چوکیدار نے غدّاری کی اور انبالہ پہنچ کر تحصیل دار کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ تحصیل دار کی اِطّلاع پر امرتسر کا ڈپٹی کمشنر فریڈرک کوپر پولیس پارٹی لے کر اُن کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

پولیس سے شدید مقابلہ ہُوا اور بہت سے حریّت پسند مارے گئے۔ باقی ماندہ افراد ایک جزیرے میں جا چھُپے۔ کوپر وہاں بھی پہنچ گیا اور سب کو گرفتار کر کے انبالے کی طرف چل پڑا۔ آدھی رات کے وقت قیدیوں کا یہ قافلہ منزلِ مقصُود پر پہنچا۔ صُبح تک کچھ اور قیدی بھی آ گئے تو اُن کی تعداد دو سو بیاسی ہو گئی۔

صُبح کو دو سو بتّیس قیدیوں کو گولی مار دی گئی۔ دس دس آدمیوں کو

قطار میں ایک جگہ لے جایا جاتا، جہاں سکھ فوجی اُنھیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیتے تھے۔ جو قیدی باقی بچ گئے، اُنھیں ایک مکان میں کھڑکیاں دروازے اور روشن دان بند کر کے دم گھونٹ کر مار دیا گیا۔ اُن کی لاشیں بھنگیوں کے ذریعہ اُٹھوا کر ایک کنوئیں میں ڈال دی گئیں۔
حکّام بالا نے فریڈرک کوپر کو اس کارنامے پر مُبارک باد دی اور اُسے اُس کی زندگی کا سب سے زیادہ جُرأت مندانہ اقدام قرار دیا۔

وزیر آباد کے قریب ایک رجمنٹ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہُوا۔ یہ رجمنٹ غیر مسلّح ہونے کے بعد بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ انگریز افسر نے سکھ دستے کے ساتھ ان لوگوں کا تعاقب کر کے سب کو پکڑ لیا۔ انگریزی فوج کے پاس اِتنے آدمیوں کو مارنے کے لیے زیادہ کارتوس نہ تھے، اس لیے اُن سب کو ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر کے اور دم گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی ظُلم و ستم کی داستانوں میں یہ واقعات سرفہرست ہیں۔
ان کے علاوہ حرّیت پسندوں نے جگہ جگہ آزادی کی مشعل کو روشن کیا۔
شام داس فقیر تین ہزار کا لشکر لے کر انگریزوں سے لڑنے نکلا، مگر شکست کھائی۔ اُسے پھانسی دے دی گئی۔
رانیا کے نواب نے آزادی کا اعلان کیا تھا۔ انگریز اُسے گرفتار کر کے فیروز پور لے گئے اور پھانسی پر چڑھا دیا۔
راؤ تلولارام نے روہتک میں بڑی جوانمردی سے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔

سیالکوٹ جولائی کے آغاز میں سیالکوٹ ہنگاموں کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ پہلے ہنگامے میں کئی انگریز مارے گئے۔ جب نکلسن کو معلوم ہُوا کہ حریت پسند دہلی جانے کی نیّت سے گورداسپور پہنچ گئے ہیں تو وہ اُن کے تعاقب میں نکلا اور گورداسپور سے دس میل کے فاصلے پر اس غیر منظّم اور غیر مُسلّح گروہ پر حملہ کر دیا۔ اس حالت میں بھی ان جوانمردوں نے بڑی جُرأت سے مقابلہ کیا۔ اس معرکے میں تین سو حریت پسند شہید ہو گئے۔ اور باقی کشمیر کی طرف چلے گئے۔ وہاں کی حکومت نے اُنھیں گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اُن سب کو، جو تعداد میں چھ سو تھے، گولی مار دی گئی۔

راولپنڈی راولپنڈی میں بھی جُون کے اواخر ہی سے فضا مکدّر ہو چلی تھی اور دیسی سپاہیوں پر سے انگریز حُکّام کا اعتماد اُٹھ گیا تھا۔ افسران نے باہمی مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ دیسی فوج سے ہتھیار واپس لے لیے جائیں۔ اس کارروائی کے لیے، ۷ جولائی کا دِن مقرّر کیا گیا۔ حسبِ دستُور میدان میں چاروں طرف توپیں نصب کر دی گئیں اور کسی غیر معمولی واقعہ سے نمٹنے کے لیے گورا فوج متعیّن کر دی گئی۔ جب دیسی فوج کو ہتھیار واپس کرنے کا حُکم دیا گیا تو وہ بھاگنے لگے۔ گورا فوج نے فوراً ایک باڑھ مار دی، جس سے بہت سے آدمی ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ جو باقی بچے اُنھوں نے مجبُوراً ہتھیار ڈال دیے۔

گورداسپُور گورداسپور کا ڈپٹی کمشنر بہت سخت گیر اور ظالم تھا۔ اُس

نے شہر پر کنٹرول کرنے کے لیے ذرا ذرا سی شکایت پر سخت سزائیں دیں۔ وہاں اسّی آدمیوں کو پھانسی اور پچیس افراد کو سزائے قید دی گئی مگر شہریوں کو جتنا خوفزدہ کیا گیا اُتنا ہی جذبۂ آزادی کو تقویّت پہنچی۔

امرتسر
یہاں کم و بیش تمام شہری آبادی انگریزوں کی دُشمن تھی اور بچّہ بچّہ اُن کے خون کا پیاسا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کوپر نفرت کے اس سیلاب کو اپنی طرف بڑھتا ہُوا دیکھ رہا تھا۔ وہ نہایت سخت مزاج اور شقی القلب انسان تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اُس نے محض اپنی سنگ دلی اور شقاوت کے بل بوتے پر اس طُوفان کو روکے رکھا۔ شہر میں پھیلتی ہوئی افواہوں اور نفرت سے بے خبر رکھنے کے لیے اُس نے سپاہیوں کا شہر میں داخلہ بند کر دیا۔ پھر وہ شہر کی طرف متوجّہ ہُوا اور چُن چُن کر تمام معزّزین شہر کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں کو گرفتار کرنے اور قید میں رکھنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ یہ لوگ کسی وقت بھی بدامنی کا سبب بن سکتے ہیں۔

ان میں بُلند مرتبے اور حیثیت کے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی مگر سب سے عام قیدیوں اور مجرموں کی طرح مشقّت لی جاتی تھی۔ گرفتار شدہ لوگوں کی تعداد کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حُکّام کو اُن کے لیے چار نئی حوالاتیں بنانا پڑیں۔ انھی قیدیوں میں ایک ہر دلعزیز سکھ مہاراج سنگھ بھی تھا جس کی عزّت ہر قوم اور فرقے کے لوگ کرتے تھے۔ اُس کے علاوہ ایک برہمن رادھا کرشن کو بھی پھانسی دے دی گئی۔ بہر حال چار سو چھہتّر حریّت پسند انگریزوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ دو افراد کو پھانسی

ہوئی اور باقی تمام قابلِ ذکر افراد کو حراست میں لے لیا گیا۔

پشاور ڈویژن

اس علاقے کے لوگ نہایت جفاکش، غیور، آزادی پسند اور جواں ہمت تھے۔ اپنے مذہب کے لیے جان دے دینا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ انھیں مسلمان بادشاہ پر انگریزوں کا دباؤ بھی گوارا نہ تھا۔ مگر سارے علاقے میں جاگیرداروں اور سرداروں کا عوام پر اتنا اثر تھا کہ وہ اُن کی مرضی کے بغیر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آزادی کی جنگ میں بھرپور حصّہ نہ لے سکے۔ انگریزوں نے اس علاقے کے بیشتر سرداروں کو اپنے ساتھ ملا کر عوام کو بے بس کر دیا تھا۔ حالانکہ عام آبادی کو جب بھی موقع ملتا، وہ مُلک اور قوم کے لیے قُربانی دینے کو تیّار ہو جاتی تھی۔

چنانچہ ۲۳ رمئی کو سب سے پہلے مردان کی رجمنٹ نمبر ۵۵ نے سرکشی اختیار کی۔ اس واقعے کی اطلاع ملتے ہی کرنل چیوٹ کی سرکردگی میں گورا فوج چار توپیں اور دیگر سامانِ جنگ لے کر نمبر ۷۰ رجمنٹ کو مردان بھیجا گیا۔ دشمن کو اتنے سازوسامان کے ساتھ آتا دیکھ کر سرکش فوجی قلعہ چھوڑ کر نکل گئے۔ انگریزی فوج نے ان کا تعاقب کیا اور سوات کی سرحد تک جگہ جگہ اُن پر حملے کرتی رہی۔ ان معرکوں میں تقریباً چھ سو نوّے افراد ہلاک یا زخمی اور ایک سو بارہ آدمی گرفتار ہوئے۔ باقی افراد نہایت پریشانی اور سراسیمگی کے عالم میں سوات کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ اُن کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جسم پر بوسیدہ کپڑے تھے اور کھانے پینے کو کچھ بھی نہ تھا۔ ہر ایک کے کندھے پہ بندوق تھی اور دل جذبۂ آزادی سے سرشار ـــــ وہ لوگ اس اُمید پر سوات گئے تھے کہ

مقامی لوگوں کی مدد سے دوبارہ منظّم ہو کر انگریزوں پر حملہ کریں گے۔ بد قسمتی سے انھیں وہاں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ تاہم سوات کے باشندوں نے سب کو بحفاظت اٹک پار پہنچا دیا۔

مشعلِ آزادی کے محافظوں کا یہ قافلہ سوات سے نکل کر جگہ جگہ بے یارومددگار ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ زخموں اور بھوک پیاس سے نڈھال افراد کو صحرانوردی اور کوہ پیمائی میں بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں نے مقامی سرداروں کو لکھ بھیجا کہ "ان ہندوستانیوں کی ناکہ بندی کر دی جائے اور ایسا بندوبست کیا جائے کہ انھیں ضروریاتِ زندگی کی چیزیں میسّر نہ آئیں۔" اِن احکام کی تعمیل میں ہر چہار طرف سے ان مظلوموں پہ حملے شروع ہو گئے۔ سب سے بڑا حملہ ۵ جولائی کو ہوا۔ حریّت پسندوں کا قیام نیلی ندی کے قریب تھا کہ ایک پہاڑی پر سے اُن پر گولیاں برسنے لگیں۔ دُوسرے دن بھی مقابلہ ہوا۔ ان معرکوں میں بہت سے آدمی مارے گئے۔ جو گرفتار ہوئے اُنھیں پھانسی دے دی گئی۔

ان تمام آفتوں سے بھی کچھ لوگ بچ گئے، جو بالائی کاغان کی ایک جھیل تک پہنچ گئے۔ یہاں بھی لوگوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر کار دن رات کے حملوں اور فاقہ کشی سے تنگ آ کر اُنھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اُن سب کو یقین دلا دیا گیا تھا کہ ہتھیار ڈالنے کی صورت میں ان کی حفاظت کی جائے گی۔ مگر جب تمام حریّت پسندوں کو غیر مسلّح کر دیا گیا تو فتح مند لوگ اپنے وعدے سے پھر گئے اور سب کو پھانسی پہ چڑھا دیا گیا۔ ان لوگوں نے آخری خواہش

یہ کی تھی کہ اُنھیں پھانسی دینے کے بجائے توپ سے اُڑا دیا جائے، مگر اس درخواست کو مسترد کر دیا گیا۔

رجمنٹ نمبر ۵۱

اس رجمنٹ میں آٹھ سو افراد تھے۔ دُشمن نے پشاور سے جمرود تک اُن کا تعاقب کیا۔ مُختلف معرکوں میں ۲۲۱ آدمی قتل ہُوئے۔ ۴۳۹ افراد کو سزائے موت دی گئی۔ ایک سو دس قیدیں رہے اور باقی بھاگ نکلے۔ ایک اندازے کے مطابق چار ماہ کے دوران صرف پشاور میں ۵۲۳ افراد کو پھانسی دی گئی یا توپ سے اُڑا دیا گیا۔ توپ سے اُڑانے کی سزا بھی اس طرح دی گئی جیسے کوئی خوشی کی تقریب یا فتح کا جشن ہو۔ میدان میں ہزاروں دیسی سپاہی موجود تھے۔ ان میں چار ہزار سپاہی تقریبًا باغی تھے اور آمادۂ جنگ تھے۔ باقی سپاہی اگرچہ تذبذب میں تھے مگر وہ انگریزوں کے وفادار نہ تھے۔ ان سب پر تین ہزار گورا فوج مسلط تھی، جو پُوری طرح ہتھیاروں سے لیس تھی۔ افسروں کے پستول اور گوروں کی بندوقیں بھری ہوئی تھیں۔ چاروں طرف توپیں نصب تھیں اور توپچی اشارے کے منتظر تیار کھڑے تھے۔ چالیس حریّت پسند ایک طرف پابہ جولاں کھڑے تھے۔

جب جنرل صاحب پریڈ کے لیے آئے تو اُنھیں سولہ توپوں کی سلامی دی گئی۔ اب دس قیدیوں کو توپ سے باندھ دیا گیا اور افسر توپ خانہ نے تلوار ہلا کر اشارہ کیا۔ فورًا توپ چلنے کی آواز آئی اور دُھوئیں کے اُوپر انسانی اعضا سر، ٹانگیں، ہاتھ اور پیر اُڑتے ہُوئے نظر آئے۔ پھر وہ

دُور جا گرے۔ یہ خونی ڈرامہ چار مرتبہ کھیلا گیا۔ ہر دفعہ فوج میں سرگوشی ہوتی۔
سپاہی اپنے ساتھیوں کا یہ المناک انجام دیکھ کر بے چین ہو رہے تھے، مگر
مزاحمت کی صورت میں کامیابی کی کوئی امید نہ تھی۔ کیونکہ ان کے پاس نہ
مناسب اسلحہ تھا اور نہ وہ منظم تھے۔ تاہم سپاہیوں نے اس واقعے کے
بعد اپنی نفرت کا اظہار اس طرح کیا کہ انگریز افسروں کو سلام کرنا چھوڑ دیا۔ اس
حرکت پر اُن کے بید لگائے جاتے اور مال و اسباب چھین لیا جاتا تھا۔

بنگال

کمپنی کے صاحبِ اقتدار لوگوں نے بنگال کی دولت کو
دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا۔ لارڈ میکالے نے اپنی رپورٹ
میں لکھا ہے کہ کمپنی اور اُس کے ملازمین پر دولت کی بارش ہوتی تھی۔ صرف
مُرشد آباد سے نقرئی سکوں کی شکل میں اسّی لاکھ پونڈ کی رقم فورٹ ولیم بھیجی گئی
تھی۔ اس رقم سے ہر انگریز خوش حال اور متموّل ہو گیا۔ خود لارڈ کلائیو کے
پاس لاکھوں روپے کی مالیت کے زر و جواہر تھے۔ افسروں کو پوری آزادی
تھی کہ جس طرح چاہیں، اپنے لیے دولت حاصل کریں۔ چنانچہ وہ اس شوق
کو پُورا کرنے کے لیے نہایت غیر ذمّہ دارانہ حرکتیں کرتے اور عوام کو اپنے
ظُلم و ستم کا نشانہ بناتے تھے۔

اس طرح تھوڑے ہی عرصے میں ملکی معیشت مفلوج ہو گئی اور سارا سرمایہ
سمٹ کر انگلستان پہنچ گیا۔ جب انگلستان میں اس دولت سے بڑے بڑے
کارخانے بن گئے تو اپنے مال کی کھپت کی خاطر ہندوستان کی صنعت و
حرفت کو تباہ کرنے کے لیے نئے نئے طریقے اختیار کیے گئے۔ ڈھاکے

کی کپڑے کی صنعت کو تباہ کرنے کی خاطر صنعت کاروں پر اتنے مظالم ڈھائے گئے کہ وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ لڈلوس نے فخریہ لکھا ہے کہ:

"ہم نے ہندوستان کی رُوئی کی صنعت کو تقریبًا تباہ کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں ڈھاکہ بڑی حد تک ویران ہو چکا ہے۔"

۱۷۷۰ء کے قحط پر تبصرہ کرتے ہوئے لارڈ میکالے لکھتا ہے:

"انگریزوں کے محلات اور باغات کے قریب دریائے ہگلی میں ہزارہا لاشیں بہتی رہتی تھیں۔ پٹنہ اور کلکتہ کے گلی کوچے بھی ان لاشوں سے بھرے پڑے تھے، جنھیں گیدڑ اور گدھ نوچتے رہتے تھے۔"

غرض انیسویں صدی کی نسل نے جب آنکھ کھولی تو یہ حالت تھی کہ آبادی کا بچّہ بچّہ انگریز سے متنفّر ہوتے ہوئے بھی اُن کا محکوم تھا۔ اُن کے ساتھ حیوانوں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ انگریز کے نام نے اتنی دہشت پھیلا رکھی تھی کہ جس بستی سے ایک انگریز گزر جاتا، وہاں آبادی گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاتی تھی۔

اس نفرت اور دہشت کے باوجود اس علاقے میں سرکشی بہت کم اور سب کے بعد ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں لوگ بے حد پسماندہ اور مفلوک الحال تھے۔ اُنھیں افلاس، بدحالی اور پستی کے شکنجوں میں ایسا کسا گیا تھا کہ بے بال و پر پرندے کی طرح تڑپ کر رہ جاتے تھے۔

چاٹگام یہاں سرکشی کا آغاز ۱۸ رنومبر کو ہُوا۔ اور ہندوستان میں جگہ جگہ جو کچھ ہُوا تھا، وہی یہاں بھی ہُوا۔ میگزین اور بارکوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ خزانہ لُوٹ لیا گیا اور قید خانہ توڑ کر قیدی چھڑا لیے گئے۔ البتہ یہاں ایک نئی بات یہ ضرور ہوئی کہ کسی انگریز کو قتل نہیں کیا گیا۔ فوجیوں نے اپنی کارروائی پُوری کی اور پہاڑوں جا چھُپے۔

ڈھاکہ یہاں فوج میں بے چینی تو بہت تھی مگر کوئی ہنگامہ نہیں ہُوا۔ انگریز حکّام نے غلطی یہ کی کہ ۲۳ رنومبر کو دیسی فوج سے ہتھیار رکھوانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بات فوجیوں کو سخت ناگوار گزری۔ کچھ سپاہیوں نے بے دلی سے ہتھیار رکھ دیے، مگر باقی فوج نے سرکشی اختیار کر لی۔ سرکش فوج جلپا کوڑی کی طرف جانے لگی تو انگریزوں نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ لوگ بھوٹان میں داخل ہو گئے۔

کلکتہ اُس زمانے میں کلکتہ کو انگریزی راج کی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں بارُود سازی اور توپیں ڈھالنے کے کارخانے تھے۔ اس کے علاوہ ہر طرح کا اسلحہ بھی جمع رہتا تھا۔ ڈم ڈم میں ایسا ٹریننگ سنٹر تھا جہاں توپیں چلانا سکھایا جاتا تھا۔ یہاں ٹکسال، کئی بنک اور تجارتی کمپنیاں تھیں! ان تمام خصوصیات نے کلکتہ کو نمایاں حیثیت دے دی تھی۔ انگریز دہلی سے زیادہ کلکتہ کو اہمیت دیتے تھے کیونکہ یہی اُن کی آخری جائے پناہ تھی۔

کلکتہ کی تین لاکھ مُسلم آبادی پر انگریزوں کو بالکل بھروسا نہ تھا۔ معزول

شاہ اودھ اور سندھ کے رئیسوں کے ساتھ بھی بڑی تعداد میں مسلح لوگ تھے۔ اُدھر بارک پور کی دیسی فوج بھی ان کے لیے خطرے کا باعث بنی ہوئی تھی۔ وہاں کے انگریز اور عیسائی ہر وقت خوفزدہ رہتے تھے لہٰذا سب سے پہلے انھوں نے بارک پور کی دیسی فوج کو غیر مسلح کیا۔ اس پر بھی اُن کی گھبراہٹ کم نہ ہوئی تو شاہِ اودھ کو عارضی طور پر گورنر جنرل کے ساتھ قیام کرنے کے بہانے نظر بند کر دیا۔ اس کے بعد اخباروں پہ پابندی لگا دی۔

جلپا گوڑی میں بھی انگریزی فوج رہتی تھی۔ وہاں ایک ضدی اور خود پسند افسر کرنیل شیر رہتا۔ اُس نے چند فوجیوں پر مقدمہ چلا کر سزائے موت تجویز کی اور میجر جنرل سے منظوری مانگی۔ میجر جنرل نے سزا کم کر کے ملازمت سے برطرفی کو کافی سمجھا اور اپنے فیصلے سے کرنل کو مطلع کر دیا۔ شیر را اتنا خودسر تھا کہ اُس نے چاروں افراد کو توپ سے اڑا دیا اور میجر جنرل کو اطلاع دے دی۔

بہار

سرزمین بہار نے حریت پسندوں کے گروہ میں ایک نہایت جوان مرد شخص کا اضافہ کیا ہے۔ وہ راجا کنور سنگھ تھا جو جگدیش پور کا جاگیردار تھا۔ جابرانہ انگریزی طرزِ حکومت کا ستایا ہُوا یہ جوان ان کے لیے مصیبت بن گیا اور مرتے دم تک اُن کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔

بہار میں ہنگامے کی ابتدا پرگنہ سنتھال سے ہوئی۔ یہاں تین آدمی رات کے وقت میجر میکڈانلڈ کے بنگلے میں داخل ہو گئے اور اسے قتل کرنا چاہا۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان میں سے ایک قتل ہو گیا اور دو کو گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں بھی مقدمہ چلا کر بڑی اذیت سے قتل کر دیا گیا۔ اس

واقعے نے سارے علاقے میں ایک کھلبلی مچا دی۔

پٹنے میں ولیم ٹیلر کمشنر تھا۔ وہ نہایت متعصب اور ظالم شخص تھا۔ دیسی فوج میں بے چینی پھیلتے دیکھ کر اُس نے انگریزوں کے لیے حفاظتی اقدامات کیے۔ سکھوں کا فوجی دستہ بھی مدد کے لیے بلا لیا گیا۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر اس نے کوشش کی کہ دیسی فوج سے ہتھیار رکھوا لیے جائیں مگر میجر جنرل لائڈ تیار نہ ہُوا۔ شہر میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی مگر کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا تھا۔ ولیم ٹیلر چین سے بیٹھنا نہ جانتا تھا۔ اُس نے اپنی انتہا پسندی سے معاملے کو بگاڑ دیا۔ اور مولانا احمد اللہ صادق پوری، مولانا شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق کو دھوکے سے گھر بلا کر نظر بند کر دیا۔ اس کے علاوہ کئی مقتدر لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں سے مولوی مہدی مجسٹریٹ اور پولیس آفیسر وارث علی کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان گرفتاریوں اور سخت سلوک نے شہریوں کو بالکل برگشتہ کر دیا۔

۳ جولائی کو پیر علی خان لکھنوی کی سرکردگی میں مجاہدین کا ایک دستہ سبز پرچم لے کر نکلا۔ وہ لوگ جہاد کی تبلیغ کرتے جاتے تھے۔ سکھ فوج نے سخت کارروائی کر کے اس دستے کو منتشر کر دیا۔ اس کے بعد کئی سرکردہ افراد کو پھانسی دے دی گئی۔

اس واقعے کے بعد ۲۵ جولائی کو دانا پور اور سگولی کی فوجوں نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ دانا پور کی فوج کو کنور سنگھ نے دریا عبور کرنے کے لیے کشتیاں اور دیگر سامان مہیا کیا۔ مجاہدین نے دریا عبور کر کے آرہ پہ حملہ کرنا چاہا۔ وہاں انگریزی فوج ایک مضبوط مکان میں محصور ہو گئی۔ اُن کی مدد کے لیے فوج کا

ایک دستہ بھیجا گیا مگر کنور سنگھ نے اُسے راستے ہی میں کاٹ دیا۔ چند آدمی جان بچا سکے۔ اُس دستے کا افسرِ اعلیٰ کیپٹن ڈیبر بھی مارا گیا۔

اس شکست نے انگریزوں کو کنور سنگھ کی اہمیت کا احساس دلایا۔ انھوں نے ایک نہایت منظّم اور نئے ساز و سامان سے لیس فوج بھیجی۔ کنور سنگھ نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، مگر اُسے پسپا ہو کر جگدیش پور کی طرف جانا پڑا۔ آرہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ کچھ دن آرام کرنے کے بعد ۱۱ر اگست کو انگریزی فوج جگدیش پور پہنچ گئی۔ یہاں کنور سنگھ سے ایک اور زبردست مقابلہ ہُوا۔ کنور سنگھ کو یہاں بھی شکست ہوئی۔ مگر وہ ہار ماننے والا نہ تھا۔ اور نا اُمید ہونا تو جانتا ہی نہ تھا۔ جگدیش پور چھوڑ کر وہ اودھ جانے کے ارادے سے نکلا اور سہسرام پہنچ گیا۔ ایک بار اور اعظم گڑھ میں انگریزوں سے لڑا۔ وہاں سے پسپا ہُوا تو دوبارہ جگدیش پور کے جنگلوں میں جا پہنچا۔ لڑائی کے دوران میں اُس کا ایک ہاتھ گولی لگنے سے زخمی ہو گیا۔ جب وہ زخم بہت تکلیف دینے لگا تو اُس نے اپنے دُوسرے ہاتھ سے وہ بازُو کاٹ کر دریا میں پھینک دیا۔ اسی حالت میں اُس جوان مرد نے انگریزوں سے آخری جنگ کی اور اُنھیں شکست بھی دی، مگر بازُو کا زخم اُس کی جان لے کر رہا۔ ۲۶ر اپریل کو وہ زخم کی تکلیف سے مر گیا۔ اُس کا بھائی امر سنگھ کچھ دن انگریزوں سے لڑتا رہا مگر حالات ناساز گار ہونے پر نیپال چلا گیا۔

جھانسی جھانسی کی ریاست کا انتظام پہلے سے انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ رانی لکشمی بائی اپنے منہ بولے بیٹے کے ساتھ ایک

محل میں رہتی تھی۔ اُس کی گزر بسر کے لیے انگریز اُسے پانچ ہزار روپیہ ماہانہ دیتے تھے۔ جھانسی کے عوام جب اپنی محبوب رانی کو کس مپرسی اور تنگ دستی کی حالت میں دیکھتے تو اُن کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا، مگر وہ مجبور تھے۔

جوں ہی میرٹھ میں انگریزوں کے خلاف سرکشی ہوئی، جھانسی کے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ ۵ر جون کو سرکشی کا آغاز ہُوا۔ انگریزوں کے لیے راہِ فرار بھی نہ تھی۔ جب کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا تو قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ ۶ر جون کو تمام افواج انگریزوں کے خلاف کھڑی ہو گئیں، اور قلعے کو سپاہیوں نے گھیر لیا۔ اس وقت تک رانی جھانسی ان ہنگاموں میں شریک نہ تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ سپاہیوں کا اِنتہا پسند گروہ جو انگریزوں کے خون کا پیاسا ہے ہنگاموں میں سب سے آگے ہے تو انسانی ہمدردی میں اس نے ایک فوجی دستہ انگریزوں کی حفاظت کے لیے بھیج دیا مگر انگریزوں نے رانی کی نیّت پر شک کرتے ہوئے اُس کی پیش کش کو قبول نہ کیا۔

چند روز میں قلعہ بند انگریزوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ بھی نہ رہا تھا اور نہ باہر سے رسد یا کمک آنے کی اُمید باقی تھی۔ اُدھر جو لوگ قلعے کو گھیرے پڑے تھے، وہ بھی عاجز آ چکے تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح جھانسی کی طرف سے یکسوئی حاصل کر کے دہلی جانے کے لیے بے چین تھے۔ چنانچہ دونوں فریقوں کی رضامندی سے یہ طے پایا کہ انگریز قلعہ خالی کر کے دیسی فوج کے حوالے کر دیں اور اس کے عوض اُنھیں حفاظت کے ساتھ جھانسی سے

جانے دیا جائے گا۔ چونکہ اُس وقت تک باغی فوج یا شہر کے نظم و نسق میں رانی کا کوئی دخل نہ تھا، اس لیے وہ اس معاہدے میں فریق نہ تھی۔

معاہدے کے مطابق انگریز قلعے کا دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ اُن میں عورتیں، مرد اور بچے سب ہی تھے۔ فوج کا تخریب پسند گروہ پہلے سے اس وقت کا منتظر تھا۔ اُنھوں نے انگریزوں کو ایک باغ میں لے جا کر قتل کر دیا اور اس طرح چند ستم گروں کی وجہ سے تحریکِ آزادی کے دامن پر بدعہدی کا دوسرا داغ پڑ گیا۔

اس قسم کے تشدّد آمیز واقعات کو جائز یا فطری قرار دینے کے لیے تاویلیں پیش کرنا، بجائے خود اعانتِ جُرم ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ جنگِ آزادی کی تاریخ میں اس طرح کے نامناسب واقعات صرف اُس جگہ ملتے ہیں جہاں لوگ پُوری طرح منظّم اور اعلیٰ قیادت سے محرُوم تھے۔ جھانسی میں بھی یہی کیفیت تھی۔ عام دیسی فوج میں کوئی سردار نہ تھا۔ ہر شخص اپنے افعال کا خود ذمّہ دار تھا اور کوئی کسی کے سامنے جواب دہ نہ تھا۔ عام سپاہیوں میں انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ اُنھیں قتل کرنے کو کارِ ثواب سمجھتے تھے۔ چونکہ رانی نے اس وقت تک مہم میں حصّہ نہ لیا تھا، اس لیے سنجیدہ شہری بھی خاموش بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے۔

سرکش فوجیوں کے دل میں رانی جھانسی کی زیادہ اہمیّت نہ تھی۔ اُن کے جسم جھانسی میں، دل دہلی میں اور نظریں شہنشاہِ ہندوستان پر لگی تھیں۔ انتقام کی آگ کو انگریزوں کے خون سے بُجھا کر وہ جلد از جلد دہلی پہنچنا چاہتے تھے

بہرحال بدعہدی ہوئی۔ خودسر اور خودرائے افراد نے انگریز عورتوں اور بچّوں کا قتلِ عام کیا۔ اُدھر سے فارغ ہو کر اُنھوں نے رانی کے محل کو گھیر لیا اور اُس سے تین لاکھ روپے کا مُطالبہ کرنے لگے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں اُنھوں نے رانی کے محل کو آگ لگانے کی دھمکی بھی دی۔ رانی کے پاس اتنی رقم کہاں تھی۔ بحالتِ مجبُوری اُس نے ایک لاکھ روپے کے جواہرات سپاہیوں کو دے کر اپنے محل اور ریاست کو بچالیا۔ سرکش فوج نے ان جواہرات ہی کو غنیمت جانا اور جھانسی چھوڑ کر دہلی کی طرف روانہ ہو گئی ـــــ رانی جھانسی کے ساتھ خودسر فوج کا یہ سلُوک ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ انگریزوں کے قتلِ عام میں کوئی صاحب رائے قائد شامل نہ تھا۔ کیونکہ جو فوج رانی کا محل جلانے کی دھمکی دے سکتی ہے اُسے دشمن قوم کے افراد پر رحم کھانے کی کیا ضرورت تھی۔

فوج کے جھانسی چھوڑنے کے بعد رانی نے اطمینان کا سانس لیا اور ریاست کے انتظام کی طرف توجہ دی۔ پُرانے بہی خواہوں کو جمع کیا، نئی فوج بھرتی کی اور وفادار امراء میں عہدے تقسیم کیے۔ سلطنت کے استحکام کے ساتھ ساتھ اُس نے رعایا کی فلاح وبہبُود کے لیے بہت سے کام کیے۔ وہ دن رات مصرُوف رہتی تھی۔ خود جگہ جگہ جا کر لوگوں کے مسائل معلُوم کرتی، مقدمات سُنتی اور فیصلے صادر کرتی تھی۔ رانی کی انتھک محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک مُختصر عرصے میں ریاست مستحکم اور رعایا خوش حال ہو گئی۔ اس عرصے میں کئی معرکے بھی ہوئے۔

رانی ابھی سکون سے نہ بیٹھ پائی تھی کہ سرہیو روز فوج لے کر پہنچ گیا اور جھانسی کا محاصرہ کر لیا۔ رانی نے انگریزوں سے فیصلہ کن جنگ کرنے کے لیے قلعے کو مضبوط کیا اور درمیانی راستوں پر حفاظتی دستے مقرر کر دیے۔
دونوں طرف سے توپوں کی جنگ ہوتی رہی۔ جلد ہی انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ جھانسی کو فتح کرنا مشکل ہے۔ ابھی وہ اس مہم کو سر کرنے کی ترکیبیں ہی سوچ رہے تھے کہ تانتیا ٹوپے بائیس ہزار سپاہیوں اور اٹھائیس توپوں کی فوج لے کر رانی کی مدد کو پہنچ گیا۔ اس اطلاع نے انگریزی فوج کو ہراساں کر دیا، مگر ہیو روز نے ان نامساعد حالات میں نہایت جوانمردی اور بے باکی سے کام لیا۔ وہ تھوڑی سی منتخب فوج لے کر تانتیا ٹوپے کو راستے ہی میں روکنے کے لیے نکل پڑا۔ روانگی سے پہلے سرہیو روز نے ایسا انتظام بھی کر دیا کہ اُس کی غیر موجودگی میں قلعے پر بدستور گولہ باری ہوتی رہے اور محصورین اُس کی غیر حاضری سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔
جھانسی سے صرف ایک میل دُور دونوں فوجوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ تانتیا ٹوپے کی فوج اس بری طرح پسپا ہوئی کہ میدان چھوڑ کر بھاگنا بھی دوبھر ہو گیا۔ اُس نے جنگل میں آگ لگا دی اور اپنی جان بچا کر بھاگا۔
یہ مہم سر کرنے کے بعد سرہیو روز پھر جھانسی کی طرف متوجّہ ہُوا اور سخت مقابلے کے بعد ۳ راپریل کو قلعے پر قبضہ کر لیا۔ انگریز فاتحین کو شہر پر قبضہ کرنے سے پہلے بے حد مشکلات اور زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ رانی اور اُس کی جاں نثار فوج نے قدم قدم پر اُن کا مقابلہ کیا اور جب تک ممکن ہو سکا

اُنھیں اندر داخل ہونے سے روکا۔
۴ر اپریل کو رانی تین سو جاں نثاروں کے ساتھ جھانسی سے نکل کر کالپی کی طرف روانہ ہوئی۔ اگرچہ انگریزوں نے اُس کا تعاقب کیا مگر اُس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ رانی کالپی پہنچ گئی اور راؤ صاحب سے فوجی امداد حاصل کی۔ وہاں تانتیا ٹوپے بھی اُس کے ساتھ ہو گیا۔
سرہیوروز کالپی کی طرف بڑھا۔ یکم مئی کو کونچ کے مقام پر دونوں فوجوں میں مقابلہ ہُوا۔ رانی کو پھر شکست ہوئی۔ وہ کالپی کی طرف پلٹی۔ انگریزوں نے کالپی پر حملہ کر دیا۔ ایک بار پھر انگریزی فوج کو رانی سے جنگ کرنا پڑی۔ زبردست جدّوجہد کے بعد انگریزی فوج نے کالپی پر قبضہ کر لیا۔ مگر رانی ہار ماننے والی نہ تھی۔ جب کالپی پر بھی دُشمن کا جھنڈا لہرانے لگا تو وہ چند سرداروں کو لے کر گوالیار کی طرف چلی گئی۔ حریّت پسندوں کے اس قافلے میں رانی کے علاوہ تانتیا ٹوپے، نواب علی بہادرخان اور راؤ صاحب بھی تھے۔
گوالیار کی فوج اور عوام بھی جذبۂ آزادی سے سرشار تھے۔ اُنھوں نے راجا کو نظرانداز کر کے آزادی کے دیوانوں کا ساتھ دیا۔ راجا کو گوالیار چھوڑ کر آگرے کی طرف بھاگنا پڑا اور گوالیار پر اُن لوگوں کا قبضہ ہو گیا۔
انگریزوں کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ رانی جھانسی جیسی بہادر عورت کو گوالیار کا مضبوط قلعہ، فوج اور خزانہ مل جائے۔ سرہیوروز عقاب کی طرح گوالیار پر جھپٹا۔ ایک دو معمولی معرکوں کے بعد گوالیار کے قریب کوٹہ کی سرائے نامی مقام پر بڑی جنگ ہوئی۔ بدقسمتی سے وہاں رانی اپنی فوج سے بچھڑ کر

انگریزوں کے نرغے میں پھنس گئی ۔ وہ مردانہ لباس پہن کر میدانِ جنگ میں لڑتی تھی، اس لیے انگریزوں نے اُسے معمولی سپاہی سمجھا۔ رانی کے جسم پہ تلواروں اور گولیوں کے کئی زخم تھے۔ اس پر بھی اُس نے دُشمن کے نرغے سے نکلنے کی کوشش کی اور تنِ تنہا مقابلہ جاری رکھا۔ گھوڑے کو ٹھوکر لگنے سے جب وہ زمین پہ گری تو انگریز فوجی آگے بڑھ گئے۔

زخموں سے چُور رانی زمین پر پڑی موت کا اِنتظار کر رہی تھی کہ ایک جان نثار لڑتا بھڑتا اُدھر آ نکلا۔ اُس نے رانی کو پہچان لیا اور اُسے اُٹھا کر قریب کی ایک جھونپڑی میں لے گیا۔ آزادی کا سُورج غروب ہونے میں چند لمحے باقی تھے۔ رانی نے وصیّت کی کہ مرنے کے بعد اُسے فوراً جلا دیا جائے تاکہ اُس کی لاش دُشمنوں کے ہاتھ نہ لگے۔ چُنانچہ اُس کی آخری وصیّت پر عمل کرتے ہوئے اس کو بلا تاخیر وہیں جلا دیا گیا۔

رانی کی موت نے انگریزوں کو مطمئن کر دیا۔ برصغیر کے وسیع و عریض خطّے میں اب کوئی ایسا شخص نہ رہا تھا جو اُن کے لیے پریشانی کا باعث بن سکتا۔

تانتیا ٹوپے، راؤ صاحب اور نواب صاحب باندہ جے پور کی طرف چلے گئے۔ مگر ان آزادی کے متوالوں کا ستارہ مستقل گردش میں تھا۔ وہ عرصے تک انگریزوں کے لیے پریشانی کا باعث تو بنے رہے مگر کوئی کارِ نمایاں انجام نہ دے سکے۔

بالآخر تانتیا ٹوپے اور راؤ صاحب مُختلف تاریخوں اور مُختلف مقامات پر گرفتار ہوئے اور دونوں کو پھانسی دے دی گئی۔ تانتیا ٹوپے کو اُس کے ایک

دوست نے دھوکا دے کر گرفتار کرایا تھا۔

نواب علی بہادر خاں پر بھی مقدمہ چلا۔ اُن کی جان بخشی تو ہو گئی مگر ریاست ضبط کر لی گئی۔ البتّہ گذر بسر کے لیے کچھ وظیفہ مقرّر ہو گیا تھا۔

پُونا پُونا میں ۵ ستمبر کو نانا صاحب کی طرف سے مرہٹہ زبان میں اشتہار چسپاں کیے گئے تھے۔ ان میں اہلِ شہر کو ترغیب دی گئی تھی کہ وہ اس علاقے کو انگریزوں سے پاک کر دیں۔ نیز گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کو قتل کرنے کی صُورت میں انعام کا اعلان بھی کیا گیا تھا۔ انگریزوں کی طرف سے بروقت احتیاطی انتظامات کر لیے گئے اور پُونا فسادات سے محفوظ رہا۔

اودھ اودھ کے حکمرانوں کے بارے میں مُورّخوں اور وقائع نگاروں نے مُختلف اور متضاد اندازِ فکر اختیار کیا ہے۔ تاہم اس ایک حقیقت پر سب متفق ہیں کہ بیشتر تاجدارانِ اودھ اپنے علاقے میں بے حد مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ ان میں ایک خاص طرح کی شانِ محبُوبی پائی جاتی تھی جو ہر حکمران کو میسّر نہیں ہوتی۔ مُلک کا انتظامی ڈھانچہ اور قوانین اس طرح ترتیب دیے گئے تھے کہ ہر فرقے، نسل اور مذہب کے لوگوں کے ساتھ انصاف ہوتا تھا۔ رعایا کے تمام طبقے اپنی جگہ مطمئن اور خوشحال تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے تعلقداروں سے لے کر معمولی درجے کے آدمی تک ہر شخص کو اپنے نوّاب سے گہری عقیدت اور محبّت تھی۔

جب دربارِ دہلی کے شبستان میں تاریکی پھیلنے لگی تو تمام صاحبانِ علم و فن نے اودھ کا رُخ کیا، جہاں ان لوگوں کا استقبال بڑی فراخ دلی سے کیا گیا۔ دربارِ

اودھ نے علوم و فنون کی سرپرستی پر خصوصی توجّہ دی اور اس طرح تمام اہلِ دانش کو دہلی سے زیادہ لکھنؤ سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔

ان حالات میں جب ۱۳ر فروری ۱۸۵۶ء کو اودھ کا الحاق عمل میں آیا تو ایک طرف ساری رعایا میں بے چینی پھیل گئی، دوسری طرف تمام اہلِ علم بے یار و مددگار رہ گئے۔

اودھ کے لوگوں نے ایک سال بڑے کرب، اضطراب اور گھٹن کی حالت میں گزارا۔ ۱۸۵۷ء کی دوسری سہ ماہی میں انگریزوں کے خلاف بے چینی اور بدظنی کی جو کیفیت برِصغیر کے دوسرے حصّوں میں پیدا ہو گئی تھی، وہی اودھ میں بھی تھی۔ ہنری لارنس چیف کمشنر مقرّر ہُوا تو اُس نے عوام کی بدگمانی کو دُور کرنے کی ایک حد تک کوشش کی، مگر اُسے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۲ر مئی کو ایک دربار منعقد کر کے لارنس نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ انگریز قوم مذہبی معاملات میں بالکل غیر جانب دار ہے۔ لہٰذا لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اس سلسلے میں تمام شکوک و شبہات کو دل سے نکال دیں۔ اس اپیل کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

جب ہنری لارنس رسمی کارروائیوں اور اُن کے نتائج کی طرف سے نااُمید ہو گیا تو اُس نے ایسے انتظامات شروع کیے، جن سے بغاوت کی صورت میں اُس کی حکومت اور قوم کے افراد کا دفاع ہو سکتا۔ سب سے پہلے اُس نے انگریزی چھاؤنیوں مچھّی بھون اور منڈیاؤں کو مضبوط کیا۔ اُن کے اِرد گرد کے علاقے کی تعمیرات کو منہدم کر کے میدان بنا دیا گیا اور وہاں بڑی بڑی توپیں نصب کر دی گئیں۔ اس کے علاوہ مچھّی بھون میں بہت بڑی مقدار میں اناج اور اسلحہ جمع کیا گیا۔ جابجا بارُود

کی سُرنگیں بچھا دی گئیں تاکہ شکست کی صُورت میں ان چیزوں کو دُشمن کے لیے ناکارہ کر دیا جائے۔

لکھنؤ میں ہنگاموں کی ابتدا ۳۰ مئی کو ہوئی۔ رات کے وقت مشتعل لوگوں نے انگریزوں کی کوٹھیوں کو نذرِ آتش کرنا شرُوع کر دیا۔ لکھنؤ کی خبریں آناً فاناً اِرد گرد کے تمام شہروں تک پہنچ گئیں اور ہر جگہ آزادی کے لیے جدّ و جہد شروع ہو گئی۔

اُس وقت فیض آباد میں حریّت پسندوں کی بڑی تعداد جمع تھی۔ اُن سب نے اِتّفاق رائے سے یہ طے کیا تھا کہ تمام حریّت پسند مل کر لکھنؤ کے راستے دہلی جائیں اور شہنشاہِ ہندوستان کے ہاتھ مضبُوط کریں۔ لکھنؤ کی طرف سے جانے میں یہ مصلحت تھی کہ تمام تعلقداروں اور آزادی پسند افراد کو ساتھ لیا جا سکتا تھا۔

۲۹ جُون کو ہنری لارنس تک یہ اطّلاع پہنچی کہ حریت پسندوں کی ایک جماعت فیض آباد کے راستے پر لکھنؤ کے قریب چنہٹ کے مقام پر جمع ہے۔ مخبروں نے یہ بھی بتایا کہ ان لوگوں میں لشکری تنظیم نہیں ہے اور وہ چھوٹے بڑے گروہوں میں بٹ کر فیض آباد سے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ہنری لارنس نے اُن کی اس سادہ لوحی اور کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کا ارادہ کیا اور چھ توپیں اور فوج لے کر اُنھیں راستے میں روکنے کے لیے نکلا۔

لیکن انگریزوں نے شمعِ آزادی کے پروانوں کی جرأت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ لوگ منظّم نہ ہوتے ہوئے بھی بڑے استقلال اور جوانمردی سے لڑے۔ اس معرکے میں انگریزوں کو بُری طرح پسپا ہونا پڑا۔ اُن کی توپیں چھن گئیں، فوج کا جانی نقصان ہُوا اور وہ بھاگنے پر مجبُور ہو گئے۔ اس فتح سے مجاہدین کے

حوصلے بڑھ گئے اور انھوں نے آگے بڑھ کر ریذیڈنسی کا محاصرہ کر لیا۔
ہنری لارنس نے ریذیڈنسی کی حفاظت کا پورا انتظام پہلے ہی کر لیا تھا۔ وہاں بارہ سو افراد پر مشتمل پیادہ اور سوار فوج موجود تھی۔ کچھ عرصہ پہلے کانپور سے ہزاروں من گندم، سوجی اور شکر بھی آ چکی تھی۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ خزانہ بھی ریذیڈنسی میں منتقل ہو چکا تھا۔
دوسری طرف حریت پسندوں نے محاصرے کے بعد ریذیڈنسی کے قریب کی تمام عمارتوں پر قبضہ کر لیا تھا اور اُن کی دیواروں میں بندوق کی نال کے برابر سوراخ کر کے بیٹھ گئے تھے۔ جہاں سے وہ دن رات چھپ چھپ کر گولیاں برساتے رہتے تھے۔ اس طرح روزانہ بہت سے انگریز مارے جاتے تھے۔ گولیوں کی اس بوچھاڑ سے ریذیڈنسی کا کوئی حصہ محفوظ نہ تھا۔
حریت پسندوں کو موقع ملا تو اُنھوں نے مورچال بنا کر جگہ جگہ توپیں بھی نصب کر دیں۔ ان میں سے بعض توپیں تو ریذیڈنسی سے صرف پچاس گز کے فاصلے پر تھیں۔ ان کے عقب میں آٹھ آٹھ فٹ گہری خندقیں کھود لی گئی تھیں تاکہ یہ توپیں دشمن کی زد سے محفوظ رہیں۔ اس کے علاوہ کئی پناہ گاہیں بھی تیار کر لی گئی تھیں۔ جب دشمن کی طرف سے گولہ باری ہوتی تو وہ لوگ اُن میں چلے جاتے تھے۔ خندقوں کی بناوٹ کچھ اس طرح تھی کہ گولے بھرتے وقت دُشمن کو اُن کے ہاتھوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔
حریت پسندوں نے انگریزوں کی طاقت کے اس مرکز کو توڑنے اور انگریزوں نے اس کی حفاظت کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ مگر فریقین میں

سے کوئی بھی اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ ایک دن اتفاقاً ہنری لارنس کی رہائش گاہ پر ایک گولہ آکر پھٹا، اور وہ اس حادثے میں زخمی ہو کر ۴ جولائی کو مر گیا۔ اس کی موت اگرچہ انگریزوں کے لیے پریشانی کا باعث بنی مگر وہ بڑی ثابت قدمی سے اپنے اس اہم مورچے کی حفاظت کرتے رہے۔

اس طرح ایک طرف محاصرے کی مدت طول کھینچتی جا رہی تھی، دوسری طرف حریت پسندوں میں ایک ایسی ہستی کی کمی محسوس کی جا رہی تھی جو مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی فوج کا سربراہ بن سکتی اور جس کے پرچم کے نیچے تمام سپاہی اور عوام متحد ہو جاتے۔ چنانچہ اتفاق رائے سے شہزادہ برجیس قدر کو اودھ کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ تاج پوشی کی رسم ۵ جولائی کو ادا ہوئی۔ شرف الدولہ محمد ابراہیم خان وزیر مقرر ہوا۔ حسام الدولہ کو فوج کے سالارِ اعلیٰ کا عہدہ دیا گیا۔ باقی تمام اختیارات علی محمد خان عرف ممو خان کے پاس رہے۔ چونکہ شہزادے کی عمر صرف تیرہ سال تھی اس لیے اُس کی والدہ حضرت محل کو حکومت کا نگران مقرر کیا گیا۔

حضرت محل بڑی اُولوالعزم اور جرأت مند خاتون تھی۔ وہ تمام صلاحیتیں جو کسی حکمران میں ہوسکتی ہیں، حضرت محل میں موجود تھیں۔ وہ نہایت منتظم، ذہین، فراخ دل اور عالی ظرف عورت تھی۔ بہادروں کی بے حد قدر کرتی اور اچھا کام کرنے والوں کو دل کھول کر انعام و اکرام دیتی تھی۔ تجربہ کار اور پختہ کار بادشاہوں کی طرح وہ تمام امورِ سلطنت سے واقفیت رکھتی تھی۔ رعایا کے ساتھ ساتھ فوج بھی اُس سے خوش تھی۔ اُس نے مولوی احمد اللہ شاہ کو بہت سے اختیار

دے دیے۔ رفتہ رفتہ لکھنؤ کے اِرد گرد کے تمام اضلاع میں آزادی کی مہک پہنچ گئی۔ کانپور، فرخ آباد، گورکھپور، فیض آباد، بہرائچ، کاکوزی، سیتاپور، ملیح آباد اور سلطان پور، غرض ہر جگہ کو انگریزوں کے وجود سے پاک کر دیا گیا۔ اب اُن کے لیے دو ہی صُورتیں رہ گئی تھیں۔ لکھنؤ پر قبضہ کر کے حریت پسندوں کے مرکز کو توڑ دیں یا پُورے علاقے سے ہاتھ دھولیں۔

لکھنؤ میں حریّت پسندوں کی ایک بڑی تعداد پہلے ہی موجود تھی۔ اس کے چاروں طرف کے تعلقدار، رئیس اور معتقد حضرات بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف سخت نفرت تھی۔ کیونکہ جب سے ان کی جاگیریں چھنی تھیں، وہ در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کو انگریزوں سے نبرد آزما ہوتے دیکھا تو دُشمن سے انتقام لینے کے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی خاطر اکٹھے ہو گئے۔

۱۷ر جولائی کو جب کانپور پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ کانپور کو ہیڈ کوارٹر بنا کر لکھنؤ کی واپسی کے لیے جدّوجہد کی جائے۔ چنانچہ ۱۲ر جولائی کو انگریزی فوج پُورے علاقے کو فتح کرنے کے اِرادے سے آگے بڑھی۔ حریّت پسندوں نے اناؤ اور بصیرت گنج میں اس فوج کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور دشمن کو شکست فاش دے دی۔ اب انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ لکھنؤ کا فتح کرنا اتنا آسان نہیں جتنا وہ سمجھتے تھے۔ ان کے لشکر میں بیماروں اور زخمیوں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اُنھیں یار و مددگار چھوڑنا بھی ممکن نہ تھا اور ساتھ لے کر آگے بڑھنا بھی خطرے

سے خالی نہ تھا۔ ابتدائی معرکوں نے انگریزی فوج کو بڑا خائف اور مرعوب کردیا تھا۔ اسی عرصے میں اطلاع ملی کہ نانا صاحب پیچھے سے اُن کا راستہ کاٹنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس خبر نے انگریزی فوج میں ایک کھلبلی مچادی۔ اور مجبوری کی حالت میں پورے لشکر کو اناؤ واپس آنا پڑا۔

انگریزوں کے لیے یہ وقت بڑا ناسازگار تھا مگر لکھنؤ کو غیر معیّنہ مدّت کے لیے آزاد چھوڑ دینا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس طرح حریّت پسندوں کو زیادہ مستحکم ہونے کا موقع ملتا۔ چنانچہ ۴ راگست کو انگریزی لشکر دوبارہ بصیرت گنج کی طرف بڑھا۔ اس دفعہ بھی لشکر کا سالارِ اعلیٰ ہیولاک تھا۔ بدقسمتی سے بصیرت گنج پہنچنے سے پہلے ہی انگریزی فوج میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ اُدھر حریّت پسندوں کے محاذ سے بڑی ہمّت شکن خبریں آرہی تھیں۔ ہیولاک کو مخبروں نے اِطلاع دی کہ آگے بیس ہزار مجاہدین انگریزوں سے نمٹنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ ان افواہوں نے انگریزی فوج میں ایسی ہلچل مچائی کہ ہیولاک کو مجبوراً کان پور واپس آنا پڑا۔

ان ناکامیوں نے ہیولاک کی شہرت کو بڑا نقصان پہنچایا۔ بریگیڈیئر نِیل اور عام انگریز اُسے کم حوصلہ اور بُزدل سمجھنے لگے۔ لہٰذا اُس کی جگہ آؤٹرم کو مقرر کیا گیا۔

دشمن کی خوبیوں کا اعتراف نہ کرنا اور اُن کی طرف سے چشم پوشی اختیار کر لینا بے انصافی ہے۔ اس طرح قوم میں اچھی اقدار کی تقلید کا رُجحان بھی کم ہو جاتا ہے اور اپنی خامیوں کا احساس بھی جاتا رہتا ہے۔ چنانچہ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اُس زمانے کے انگریزوں میں بھی قوم پرستی کا جذبہ کتنا شدید تھا۔ انگریز افسروں

میں اقتدار کی رسّا کشی اور باہمی رقابت بالکل نہ تھی ۔ وہ ہر معاملے میں ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیتے تھے ۔ کوئی انگریز افسر اپنے ساتھی کی تذلیل اور بدنامی سے خوش نہ ہوتا ۔ چنانچہ آوٹرم کا تقرّر ہوا تو اُس نے ہیولاک کے دامن پہ لگے ہوئے بزدلی کے داغ کو دھونے کی کوشش کی ۔ اُسے بدستور فوج کا افسرِ اعلیٰ رہنے دیا اور خود چیف کمشنر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اِس کے علاوہ اُس نے ایک اعلان کے ذریعہ ہیولاک کی گزشتہ کارروائیوں کو بے حد سراہا ۔

اُدھر حرّیت پسندوں نے ۱۰ راگست کو ایک اور سُرنگ اُڑا دی ۔ اُس سے ریذیڈنسی کی دیوار اُڑ کر پیچھے کی طرف جا گری ۔ اس دھماکے سے دیوار میں اتنا بڑا سُوراخ ہو گیا کہ پُوری ایک رجمنٹ اُس کے ذریعے اندر داخل ہو سکتی تھی ۔ اُنھوں نے اس راستے سے اندر جانے کی کوشش بھی کی ، مگر انگریزوں کی زبردست مزاحمت نے اُنھیں کامیاب نہ ہونے دیا ۔ یہاں دونوں فریق بڑی بے جگری سے لڑے ۔

اُس کے بعد حرّیت پسندوں کا ایک دستہ اُس مورچال پر حملہ آور ہوا جس کا رُخ کانپور کی طرف تھا ۔ اُنھوں نے آگے بڑھ کر خندق پر قبضہ کر لیا ۔ مگر یہ قبضہ تھوڑی دیر قائم رہا ۔ وہاں سے ہٹ کر حرّیت پسند دوسرے مورچے پہ حملہ آور ہوئے اور دیواروں پر سیڑھیاں لگا کر اُوپر چڑھنا چاہا ۔ اس میں کامیابی نہ ہوئی تو وہ واپس اپنے مورچوں میں چلے گئے اور اُسی طرح گولیاں برسانے لگے ۔

۱۸ راگست کو ایک اور سُرنگ اُڑا دی گئی ۔ اس سے انگریزوں کو بڑا نقصان پہنچا ۔ کئی افسر اس حادثے میں کام آئے ۔

۵ ستمبر کو پھر ایک سُرنگ اُڑی اور ساتھ ہی مورچے پر حملہ ہو گیا ۔ حرّیت پسند

سیڑھیوں کے ذریعہ دیواروں پر چڑھ گئے۔ اس دن ہر محاذ پر زبردست جنگ ہوئی اور دونوں طرف بے حد جانی نقصان ہوا۔ چونکہ انگریزوں کے پاس گولہ اندازوں کی کمی تھی اور توپوں کی تعداد ان سے زیادہ تھی، اس لیے انھیں زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا۔

لیکن بدقسمتی سے لکھنؤ کی قیادت اندر ہی اندر تین دھڑوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک طرف دیسی افواج کو یہ گھمنڈ تھا کہ محض اُن کی تلوار نے انگریزوں کو قلعہ بند ہونے پر مجبور کیا ہے۔ دوسری طرف مولوی احمداللہ شاہ کی طاقت تھی، جو لکھنو کے عوام اور مختلف علاقوں کی فوج میں بہت مقبول تھے۔ تیسری بڑی طاقت دربارِ اودھ کی تھی۔ انگریزوں کے خلاف سب کا جوش و خروش اگرچہ یکساں تھا مگر پس پردہ کچھ چنگاریاں بھی سلگ رہی تھیں۔ دو بڑی طاقتوں یعنی دربارِ اودھ اور مولوی احمداللہ شاہ کے حواری آپس کی چشمک اور رقابت کی بنا پر ان چنگاریوں کو ہوا دیتے رہتے تھے۔ تاہم حضرت محل کی ذہانت اور مولوی احمداللہ شاہ کی اعتدال پسندی اُنھیں ڈھکے ہوئے تھی اور اُڑبنے نہ دیتی تھی۔

انگریزوں کو ان اختلافات کی اطلاع ملی تو اُنھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اہلِ لکھنؤ کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک لشکر اُدھر بھیج دیا۔ یہ لشکر ۲۳ ستمبر کو عالم باغ پہنچا جو لکھنو سے صرف چار میل کے فاصلے پر تھا۔ اس مہم سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ ہیولاک اور آؤٹرم لڑتے بھڑتے ریذیڈنسی میں داخل ہوگئے۔ باہر گلی کوچوں میں گھمسان کی

جنگ ہوتی رہی۔ نیل بھی یہیں قتل ہُوا۔ انگریزوں کے لیے یہ حملہ اُلٹا نقصان دہ ثابت ہُوا، کیونکہ اس طرح حملہ آور فوج اور افسر ریذیڈنسی میں محصُور ہو گئے۔

اسی دوران میں دوسرا انگریزی لشکر کالن کیمبل کی سرکردگی میں ۹ رنومبر کو عالم باغ پہنچا۔ مگر وہ بھی کوئی کارِنمایاں انجام دیئے بغیر ریذیڈنسی میں داخل ہو گیا۔ بلکہ اس طرح انگریزوں کی مشکلات میں اور اضافہ ہو گیا۔ فوج کا بڑا حصّہ اور افسران ریذیڈنسی میں معطّل پڑے تھے اور کانپور کا محاذ کمزور پڑ چکا تھا۔ اب انگریزوں کو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا کہ کسی طرح کانپور کی حفاظت کی جائے، کیونکہ سارے علاقے میں اب وہی انگریزی طاقت کا مرکز تھا۔ چنانچہ کالن کیمبل نے ریذیڈنسی کو خیرباد کہا اور ہیولاک اور آوٹرم کو عالم باغ میں چھوڑ کر کان پور چلا گیا۔

ادھر لکھنؤ میں دہلی، آگرہ اور کانپور کے بے شمار حریّت پسندوں کے ساتھ ساتھ بہت سے اہل الرائے بھی جمع ہو چکے تھے۔ ان میں نانا صاحب، بخت خان، شہزادہ فیروز شاہ، مرزا کوچک سلطان، مولوی لیاقت علی اور قاضی سرفراز علی شامل تھے۔ تاہم لکھنؤ کے تمام محاذوں کی سرداری حضرت محل ہی کے پاس تھی۔

کچھ عرصے تک انگریز ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اُلجھے رہے۔ جب ہر طرف خاموشی چھا گئی اور اودھ کے علاوہ پورے برِّصغیر پر ان کا تسلّط بحال ہو گیا تو ہر طرف سے مطمئن ہو کر انھوں نے فروری ۱۸۵۸ء میں پھر لکھنؤ

پر حملہ کیا۔ اُس وقت تک ہندوستان بھر کے محاذوں سے ان کی فوجیں کامیابی کے ساتھ لوٹ کر یکجا ہو چکی تھیں۔ اب انگریزوں کی پوری طاقت سے تنہا لکھنؤ کا مقابلہ تھا۔

لکھنؤ میں قدم قدم پر انگریزوں کی مزاحمت کی گئی۔ یہاں کی ایک ایک اینٹ نے غیر ملکی تسلّط کو روکنے کی کوشش کی۔ عورتوں، مردوں اور بچّوں نے وہ بہادری کے جوہر دکھائے کہ انگریز حیران رہ گئے۔ اُنھیں اتنے زبردست مقابلے کی ہرگز اُمید نہ تھی۔ انھی معرکوں میں ہڈسن بھی قتل ہُوا۔ لکھنؤ کے عوام کی جراٗت کے واقعات آزادی کی تاریخ میں سُنہری حروف میں لکھے گئے ہیں۔ نواب گنج، چکراولی کوٹھی، سکندر باغ اور عیش باغ کے مورچوں پر زبردست معرکے ہوئے۔ حضرت محل غیر معمولی شجاعت اور جراٗت سے کام لیتے ہوئے فوج کی سرداری کرتی رہی۔

سکندر باغ پر یورش ہوئی تو حبشی عورتیں انگریزوں کے مقابلے پر آگئیں۔ جب تک اُن میں سے ایک عورت بھی زندہ رہی، انگریزوں سے مقابلہ جاری رہا۔ ان کی وضع قطع، لباس، قدو قامت، بہادری اور جنگی صلاحیتوں کی بنا پر دشمن اُنھیں مرد ہی سمجھ رہا تھا۔ مگر جب وہ سب مر گئیں تو معلوم ہُوا کہ عورتیں تھیں۔ انگریز مورّخوں نے ان عورتوں کو شیرنیوں سے تشبیہہ دی ہے۔

بہرحال قدم قدم پر لڑ کر اور ہر جگہ مُنہ توڑ حملوں کا مقابلہ کر کے انگریزوں نے لکھنؤ فتح کر لیا اور برِّصغیر کے اسلامی دَورِ حُکومت کا آخری ستوُن بھی

منہدم کر دیا گیا۔ عیش باغ پر بھی حریت پسندوں کو شکست ہوئی تو حضرت محل برجیس قدر کو لے کر لکھنؤ سے چلی گئی۔ شہزادہ فیروز شاہ، بخت خان، نانا صاحب اور مولوی احمداللہ شاہ کو بھی لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔

اب مجاہدین اور اُن کے سردار شاہجہان پور میں جمع ہو گئے تھے۔ ۲۰ را پریل کو انگریزی فوج سے پہلا مقابلہ ہوا جس میں مجاہدین پسپا ہو گئے۔ مولوی احمداللہ شاہ کے پاس شہر کی فوج تھی۔ اُنھوں مصلحتاً شہر کو خالی کر دیا اور تین دن بعد واپس آ کر دوبارہ شاہجہان پور پر حملہ کر دیا۔ یہ جنگ ۳رمئی سے ۹رمئی تک جاری رہی۔ شاہ صاحب کی مدد کو حضرت محل اور شہزادہ فیروز شاہ بھی پہنچ گئے تھے۔ ۱۵رمئی کو سخت مقابلہ ہوا۔ جب انگریزوں کو بریلی سے امداد مل گئی تو اُن کا پلّہ بھاری پڑ گیا۔ وہاں سے ہٹ کر مجاہدین محمدی چلے گئے۔ مگر جلد ہی انگریزوں نے اس قصبے پر بھی حملہ کر دیا۔ یہاں بھی اُنھیں فتح نصیب ہوئی اور مجاہدین کو یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی۔

اب حضرت محل، نانا صاحب، عظیم اللہ اور بخت خان اپنے جاں نثاروں کو لے کر نیپال کی طرف چلے گئے۔ مولوی احمداللہ شاہ راجا بلدیو سنگھ کی ریاست میں چلے گئے تھے۔ وہاں راجا نے آپ کو دھوکے سے شہید کر دیا۔ اس کارنامے کے سلسلے میں حکومت نے اُسے پچاس ہزار روپیہ انعام دیا۔ شاہ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اُن کی تلوار نے کبھی کسی بے گناہ کو مجروح نہیں کیا۔ اُن کے پیرومُرشد حضرت محراب شاہ قلندر کا یہی حُکم تھا، جس کی وہ آخری دم تک تعمیل کرتے رہے۔

انگریز افسروں نے لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد حسب دستور وہاں بھی قیامت برپا کردی۔ لوٹ مار، گرفتاری اور پھانسیوں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ بڑے بڑے مشہور لوگوں کی جائدادیں ضبط کرلی گئیں اور اُنھیں آزادی کی جنگ لڑنے کے قصور میں اذیّت ناک سزائیں دی گئیں۔

راجا جے لال نصرت جنگ کو پھانسی دے دی گئی۔

مولوی لیاقت علی، مولوی سرفراز علی اور مولانا فضل حق خیرآبادی کو کالے پانی کی سزا ملی۔

دہلی

شہنشاہ ہندوستان کا نام آتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ایسے عالی مرتبت شخص کا تصوّر آجاتا ہے جو شاہجہاں کے بنائے ہوئے عظیم الشان لال قلعے میں نہایت شان اور دبدبے سے رہتا ہوگا۔ بہترین مغل، راجپوت اور افغان فوجیں اُس کے اشارے کی منتظر کھڑی رہتی ہوں گی۔ اُس کا دربار بڑے بڑے دانشوروں، عالموں، مہندسوں اور جاں نثار امیروں سے بھرا رہتا ہوگا۔ خزانے میں سونے، چاندی اور زر و جواہر کے ڈھیر لگے ہوں گے۔ اُس کے حکم پر ہندوستان کے تمام صوبے دار، نوّاب اور راجا سرِتسلیم خم کر دیتے ہوں گے۔ مگر اٹھارویں اور انیسویں صدی میں شاہانِ دہلی کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی۔ اُن کے پاس نہ فوج تھی، نہ خزانہ، نہ شان و شوکت تھی، نہ رُعب و دبدبہ۔ وہ اس مجاور کی طرح تھے جو کسی مشہور ہستی کے مزار پہ جھاڑو دینے اور چراغ جلانے پر مامور ہو اور اس خدمت کے عوض تنخواہ پاتا ہو۔

خاندانِ مغلیہ کے اس آخری نشان کو انگریز جلد از جلد مٹا دینا چاہتے تھے مگر

جب وہ کروڑوں انسانوں کے دل میں اپنے بادشاہ کے لیے عقیدت اور احترام دیکھتے تو اپنے اقتدار کی سفید چادر پر اس داغ کو قائم رکھنے کے لیے مجبور ہو جاتے تھے۔ لارڈ ویلزلی نے شاہ عالم ثانی کو دہلی شہر کا اختیار اور وظیفے کے ساتھ کچھ جاگیر دے کر، اُس کے بڑھاپے، افلاس اور بدحالی پر رحم نہ کھایا تھا، بلکہ اس نوازش کے عوض دہلی کے علاوہ تمام ہندوستان کی اجارہ داری کی سند حاصل کر لی تھی۔ اس طرح اُس نے سادہ لوح عوام کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اُن کے بادشاہ نے اس اجنبی قوم کو قبول کر لیا ہے۔

شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ ثانی کا دَور آیا تو بادشاہ ذہنی طور پر بھی قلعے میں محبوس ہو گیا۔ اُسے دہلی سے باہر کی دُنیا کے حالات کا علم ہی نہ تھا۔ مصاحب اور ندیم جو اُسے ہر وقت گھیرے رہتے تھے، اُس کو زمانے کی تبدیلی اور وقت کے تقاضے کا احساس ہی نہ ہونے دیتے تھے۔ ان سب نے مل کر بادشاہ کو ایک ایسا اداکار بنا دیا تھا جو بادشاہ کا پارٹ ادا کرتے کرتے خود کو بادشاہ ہی سمجھنے لگا ہو۔ لال قلعے میں بے شمار شہزادے، اُمرار، رؤسار اور شاہی خاندان کے افراد موجود تھے مگر اُن میں ایک بھی سراج الدولہ، ٹیپو یا بیرم خان نہ تھا۔ وہ سب اپنے اپنے مفاد کی خاطر جائز و ناجائز حرکات کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اُن سب کے درمیان بادشاہ پتّھر کے ایک بُت کی طرح تھا، جس کی پرستش کی جاتی ہے، مگر جو اپنے پُوجنے والوں پر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

اکبر شاہ نے کئی دفعہ کوشش کی کہ انگریز اُس کا وظیفہ بڑھا دیں۔ مگر وہ ناکام رہا۔ آخری دَور میں انگریزوں نے اُس کی درخواست پر وظیفہ گو بڑھا دیا تھا مگر

ریذیڈنٹ کے علاوہ دُوسرے لوگوں سے نذر وصُول کرنے کا اختیار چھین لیا تھا۔ اس پابندی نے رہے سہے شاہی وقار کو بھی مجرُوح کر دیا۔

۲۸ر ستمبر ۱۸۳۷ء کو اکبر شاہ ثانی نے وفات پائی۔ اُس کے بعد بہادُر شاہ تخت نشین ہوئے۔ تاجپوشی کے وقت اُن کی عُمر تقریبًا چونسٹھ سال تھی۔ عُمر کے اس دَور میں جب انسان ہر طرح کی جولانیوں، اُمنگوں اور ولولوں سے محروم ہو جاتا ہے، بہادُر شاہ اپنے خاندان کے کھوئے ہوئے وقار کو چھیننے کے لیے کس طرح سوچ سکتے تھے۔

اب قلعے کا ماحول اور بھی دُھندلا ہو چکا تھا۔ شاہی خاندان کے دل و دماغ میں یہ بات رچ بس گئی تھی کہ اُن کی پرورش انگریزوں کے وظیفے پر ہے لہذا ہر بادشاہ اپنے وظیفے کی رقم بڑھوانے کی کوشش کرتا۔ گویا بادشاہت کا مقصد یہی رہ گیا تھا کہ پنشن پر گزر اوقات ہوتی رہے چنانچہ بہادُر شاہ نے وظیفے میں اضافے کی کوشش شروع کر دی۔

اس کے برعکس انگریز ہمیشہ اس فکر میں لگے رہتے کہ بادشاہ کی اہمیّت کو کس طرح کم کیا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے کسی معقول وجہ کے بغیر ریذیڈنٹ کو بادشاہ کے سامنے نذر پیش کرنے کی پابندی سے آزاد کر دیا۔ یہ بات بہادُر شاہ کو سخت ناگوار گزری۔ اُنھوں نے اس حُکم کی منسُوخی کے لیے بہت دوڑ دھوپ کی، مگر حسبِ دستور انگریزوں نے اُنھیں کورا سا جواب دیا۔ البتّہ وہ اس بات پر تیّار ہو گئے کہ اگر بادشاہ ہمیشہ کے لیے اپنے مطالبات سے دست کش ہو جائے تو اُس کا وظیفہ بڑھا دیا جائے گا۔ بہادُر شاہ نے انگریزوں کی اس پیش کش کو ٹھکرا کر شاہی وقار کی گرتی ہوئی دیوار

کو سہارا دیا۔ تخت نشینی کے بعد یہ اُن کا پہلا جرأت مندانہ اقدام تھا۔

وظیفے میں اضافے کا معاملہ دبنے کے بعد بادشاہ کی توجہ ولی عہدی کے مسئلے پر لگ گئی۔ خزانہ، شان و شوکت، فوج یا مُلک کچھ بھی باقی نہ تھا مگر نام کی بادشاہی اور ولی عہدی کا تنازعہ موجود تھا۔ انگریز دارا بخت کو ولی عہد تسلیم کر چکے تھے مگر زینت محل اپنے لڑکے جواں بخت کو ولی عہد بنانے پر مصر تھیں۔ بادشاہ پر ملکہ کا اثر غالب تھا۔ چنانچہ ۱۸۴۹ء میں دارا بخت کی وفات کے بعد انھوں نے جواں بخت کی ولی عہدی کو انگریزوں سے تسلیم کرانے کی کوشش کی۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ بادشاہ کی ہر فرمائش کو مان لینے سے اُن کی برتری برقرار رہے گی۔ چنانچہ بہادر شاہ کی کوشش بیکار گئی اور انھوں نے میرزا فخرالدین کو ولی عہد تسلیم کر لیا۔ اس فیصلے کے پیچھے دراصل ایک سازش کام کر رہی تھی۔ انگریز پہلے ہی مرزا فخرالدین سے خفیہ معاہدہ کر چکے تھے کہ اگر اُسے ولی عہد تسلیم کر لیا جائے تو وہ بہادر شاہ کے بعد لال قلعے کی سکونت اور "بادشاہ" کے خطاب سے دستبردار ہو جائے گا اور آیندہ خاندان کا سب سے بڑا آدمی صرف شہزادہ کہلائے گا۔

۱۸۵۶ء میں میرزا فخرالدین بھی فوت ہو گیا۔ بہادر شاہ نے ایک بار پھر جواں بخت کو ولی عہد کرانے کے لیے کوشش کی۔ مگر انگریزوں نے اس دفعہ صاف جواب دے دیا۔ بہادر شاہ کو اس واقعہ کا بے حد افسوس ہوا اور وہ ہمیشہ کے لیے انگریزوں سے بدظن ہو گئے۔

غرض جب میرٹھ میں آزادی کا پرچم بلند ہوا اور وہاں کی فوج انگریزوں کا صفایا کر کے عازمِ دہلی ہوئی تو یہاں کی یہ حالت تھی کہ لال قلعہ شاہی خاندان اور

مقتدر اُمرا، کی سازشوں کا اکھاڑا بنا ہُوا تھا۔ زینت محل، میرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ خان جیسے درباریوں کے درمیان ایک نحیف و نزار بادشاہ حیران و پریشان ہر بے تدبیری کو دیکھ رہا تھا مگر کچھ کرنے سے معذور تھا۔

شہر کے عوام آزادی، بادشاہ سے وفاداری، اسلامی سلطنت کے استحکام اور لال قلعے کے وقار کی خاطر سر بکف تھے۔ البتہ کچھ حقیقت پسند لوگ خواص کی بداعمالیوں اور مفاد پرستی کو دیکھ کر مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ آبادی کا بیشتر حصّہ محض اس اُمید پر انگریزوں سے لڑنے کو تیار تھا کہ ایک بار آزادی کی شمع روشن ہو گئی تو پڑوسی ملک مدد کو دوڑ پڑیں گے۔ ایک خاص طبقہ اس اُمید پر بیٹھا تھا کہ کوئی غیبی طاقت عنقریب انگریزوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گی۔ عُلما دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک محدُود حلقہ انگریزوں کا حامی تھا، مگر اکثریت جہاد کے جذبے سے سرشار تھی۔

جنگِ آزادی کے وقت دہلی کا پورا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ قلعہ کی حفاظت کے لیے بھی گوروں کا ایک دستہ مقرر تھا، جو کپتان ڈگلس کی سرکردگی میں تھا۔ شہر کے حُکّام میں سائمن فریزر کمشنر تھا۔ مٹکاف دہلی کا مجسٹریٹ اور ہچن سن کلکٹر تھا۔ باقی تمام محکموں کے افسرانِ اعلیٰ بھی انگریز تھے۔ کشمیری دروازے کے باہر انگریزی فوج کی ایک بہت بڑی چھاؤنی تھی۔

افواجِ میرٹھ کی آمد میرٹھ میں انگریزوں کے خلاف جس مہم کا آغاز کیا گیا تھا، اگر وہ ناکام ہو جاتی تو تحریک میں حصّہ لینے والوں کے حق میں نہایت خطرناک نتائج نکلتے ——— انھیں

طرح طرح سے اذیت دے کر قتل کیا جاتا اور بے شمار امن پسند شہریوں کو بھی محض شک کی بنا پر سخت سزائیں دی جاتیں۔ ان تمام امکانات سے باخبر ہوتے ہوئے بھی سپاہیوں نے وطن کی محبت، غیر ملکی حکومت سے نفرت اور بادشاہ کی اطاعت کی خاطر جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک منظم حکومت سے ٹکر لی تھی۔ اُن کے پاس نہ سامانِ جنگ تھا، نہ باقاعدہ فوجی تنظیم۔ ملک کے تمام ذرائع اور وسائل انگریزوں کے ہاتھ میں تھے۔ اُن کے پاس باقاعدہ اور جنگی مہارت رکھنے والی گورا فوج، توپیں، بندوقیں اور دیگر اسلحہ تھا۔ مواصلاتی نظام پر بھی انگریزوں ہی قبضہ تھا۔ حریت پسندوں کی تعداد خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہوتی، وہ انگریزی فوج سے دُوبدُو لڑ کر کبھی نہ جیت سکتے تھے۔ غیر ملکی تسلّط کے خلاف جنگ کی ترغیب دینے والوں نے اُنھیں پہلے ہی ہدایات دے دی تھیں کہ انگریزوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں قتل کر کے اُن کی طاقت کو توڑ دیا جائے، اور اُنھیں ہندوستان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا جائے۔ چنانچہ حب الوطن کے جذبے سے سرشار یہ لوگ میرٹھ میں اپنا کام ختم کر کے وطن کی عظمت کے گیت گاتے ہوئے آناً فاناً دہلی پہنچ گئے۔

میرٹھ کے سپاہیوں کے دل میں انگریزوں کے لیے جتنی نفرت تھی، اپنے مظلوم اور بے بس بادشاہ کے لیے اتنی ہی عقیدت تھی۔ وہ ۱۱ر مئی کو دہلی پہنچے۔ قدم رکھتے ہی یہاں وہ اپنے بادشاہ کی ایک جھلک دیکھنے اور اس کے مُنھ سے حوصلہ افزائی کے دو لفظ سُننے کے لیے بے چین ہو گئے۔ چنانچہ شاہی محل کی دیوار کے نیچے کھڑے ہو کر اُنھوں نے بادشاہ کو پُکارنا شروع کر دیا۔ سائمن فریزر

کو اطلاع ملی تو وہ بگھی میں بیٹھ کر وہاں پہنچا۔ اُسے دیکھ کر سپاہی مارنے کے لیے اُس پر جھپٹے۔ فریزر براہ سمن برج قلعے میں جا گھسا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

بہادر شاہ کو اُس وقت تک حالات کا صحیح علم نہ تھا۔ ممکن ہے کہ اُن کے مصاحبوں اور درباریوں نے میرٹھ کے ہنگامے اور سپاہیوں کے دہلی کی طرف کوچ کرنے کی اطّلاع دی ہو۔ تاہم وہ ان جانبازوں اور جاں نثاروں کے دلی جذبات سے قطعی ناواقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شور سُن کر اُنھوں نے خود شاہی جھروکے تک جانے کے بجائے قلعے کے انگریز محافظ ڈگلس کو اُدھر بھیجا۔ ڈگلس نے ایک بُلند مقام پر کھڑے ہو کر لوگوں کو سمجھایا کہ شاہی خواب گاہ کے قریب شور و غُل نہ کریں۔ چنانچہ تمام سپاہی وہاں سے ہٹ کر راج گھاٹ دروازے کی طرف چلے گئے۔

بہادر شاہ ابھی تک کشمکش و پیچ میں تھے۔ ایک باوقار اور اہم شخصیّت کے لیے چند سپاہیوں کا شور اور نعرے سُن کر بغیر سوچے سمجھے اُن تک پہنچ جانا، مناسب نہ تھا۔ اور ابھی تو اُنھیں اِس تحریک کے بارے میں پوری معلومات بھی نہ تھیں۔ یہ بھی وثوق سے نہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ صرف بعض جذباتی نوجوانوں کا شور تھا یا مخلص، جری اور باہمت لوگوں کی کوشش۔ پھر بھی بہادر شاہ کتنے ہی بے سرو سامان اور مجبور کیوں نہ ہوں، وہ اپنی اہمیّت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انگریز بادشاہت کے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گُل کرنا چاہتے ہیں جس کی روشنی کروڑوں انسانوں کے دلوں تک پہنچتی ہے۔

ان کی ذرا سی لغزش انگریزوں کے لیے ایک بہانہ بن سکتی تھی۔

اس اثنا میں اچانک راج گھاٹ کے دربانوں میں سے کسی نے دروازہ کھول دیا اور فوج اندر آ گئی۔ سپاہی پہلے ہی کچھ کم مشتعل نہ تھے۔ تھوڑی دیر پہلے بادشاہ کی جگہ انگریز افسر ڈگلس کو دیکھ کر اُن کا جوش اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس کے علاوہ شہریوں کی ایک بڑی تعداد جو مدّتوں سے انگریزی اقتدار کے زخم کھا رہی تھی اور ایسے ہی کسی موقع کی منتظر تھی، سپاہیوں کے ساتھ ہو گئی تھی۔ عام دستور کے مطابق ایسے موقع پرست لوگوں نے، جن کا مشغلہ قتل و غارت گری تھا، بڑھ کر تحریک کا پرچم اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دیکھتے دیکھتے اُسے انگریزوں کے خون سے رنگ ڈالا۔

انگریز مرد، عورتوں اور بچّوں کا جو قتل عام اس موقع پر ہُوا، وہ کسی طرح قابلِ تعریف نہ تھا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح کی تحریکیں جب کامیابی کے قریب پہنچتی ہیں تو اُس مست ہاتھی کی طرح ہو جاتی ہیں جو مہاوت کے ہاتھوں سے نکل کر آبادی کو نقصان پہنچاتا پھرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہاتھی کی اس وحشیانہ حرکت کا ذمّہ دار مہاوت نہیں ہوتا۔ بہرحال قتل خواہ دشمن کا ہو یا دوست کا، اُسے اچھا فعل قرار دینا بجائے خود ایک جُرم ہے۔

سراسیمگی کے عالم میں انگریز افسر بھاگ کر کلکتہ دروازے پر جمع ہو گئے۔ ابھی وہ لوگ آئندہ اقدامات کے لیے مشورہ ہی کر رہے تھے کہ فوج وہاں بھی آ پہنچی۔ سائمن فریزر کے ہاتھوں ایک آدمی کا قتل کیا ہُوا کہ ساری فوج نے ہلّا بول دیا۔ مجبُوراً انگریزوں کو بھاگ کر قلعے میں پناہ لینا پڑی مگر اس طرح

بھی وہ اپنی جان نہ بچا سکے۔ ہزارہا مشتعل افراد کے ہجوم میں پھنس کر وہ سب قتل ہو گئے۔ اس کے علاوہ فوجی ہر اُس جگہ پہنچ گئے جہاں انگریز رہتے تھے اور جو سامنے آیا اُسے قتل کر دیا۔

دہلی کے بڑے بڑے حُکام میں سے صرف مٹکاف بچ کر بھاگ سکا۔ لوگوں نے اُس کا پیچھا کر کے اُسے قتل کرنے کی کوشش کی مگر وہ سب سے لڑتا بھڑتا بھاگتا رہا اور بالآخر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

جب تمام انگریز قتل یا روپوش ہو گئے تو فوج اور عوام مل کر بنک کی طرف چل پڑے۔ بنک کا مینجر اپنے خاندان کو لے کر چھت پر چڑھ گیا اور وہاں سے مزاحمت کرتا رہا۔ مگر مشتعل لوگوں نے اُن سب کو مار کر اور بنک کو لوٹ کر آگ لگا دی۔

بنک کے بعد مشتعل ہجوم دہلی گزٹ پریس کی طرف گیا اور عمارت میں گھُس کر کمپوزیٹروں کو قتل کر کے تمام سامان توڑ پھوڑ ڈالا۔ وہاں سے آگے بڑھ کر لوگ گرجا پہنچ گئے۔ وہاں دیواروں پر لگی ہوئی یادگاری سلیں اُکھاڑ کر پھینک دیں، عمارت کو نقصان پہنچایا اور گھنٹا گرا دیا۔

اس عرصے میں چھاؤنی سے فوج بھیج دی گئی تھی۔ مگر اس میں جتنے دیسی سپاہی تھے وہ اپنے بھائیوں سے جا ملے اور اس طرح بہت سے انگریز افسر مارے گئے۔ البتہ کچھ رحم دل سپاہیوں نے انگریزوں کو محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔
دیکھتے ہی دیکھتے شہر سے غلامی کے تمام نشانات مٹا دیے گئے۔ اب فوج کے لیے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح میگزین پر قبضہ کیا جائے۔ میگزین

کی حفاظت پر جو لوگ مقرّر تھے اُن میں نو انگریز تھے۔ چونکہ دیسی سپاہیوں پر بھروسا کرنا حماقت تھی اس لیے انھی نو انگریزوں نے اس کی حفاظت کا بیڑا اُٹھایا۔ اور بلاشبہ اُنھوں نے نہایت ہمّت اور جواں مردی سے کام لے کر ایسا کارنامہ انجام دیا جو اُن کی قوم کے لیے باعثِ فخر ہے۔

اُن نو انگریزوں نے پیچھے کی طرف مٹّی سے بھرے ہوئے بورے رکھ کر میگزین کا دروازہ بند کر دیا۔ مناسب مقامات پر دو توپیں بھی نصب کر دیں اور دُور دُور تک بارُود بچھا دی۔ جب میگزین کی حفاظت کی تمام امیدیں ختم ہو گئیں تو اُنھوں نے جان پر کھیل کر آگ لگا دی۔ ایک دھماکے کے ساتھ میگزین کا بڑا ذخیرہ تباہ ہو گیا۔ اس مہم میں پانچ انگریز کام آئے۔

ادھر لوگوں نے جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو چھڑا لیا۔ چھاؤنی کے جو انگریز بچ گئے تھے وہ اپنے بال بچّوں اور سامان کو گاڑیوں میں لاد کر مختلف مقامات کی طرف بھاگنے لگے۔ ان میں سے کچھ منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ راستے میں مارے گئے۔ بہت سی عورتیں، مرد اور بچّے قید ہو کر لال قلعہ پہنچ گئے اور کچھ سرپھرے لوگوں نے اُنھیں بھی قتل کر ڈالا۔

صاحبِ اقتدار دِن کو رات، رات کو دن، چور کو شاہ اور شاہ کو چور کہیں، تب بھی عوام کو ماننا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کچھ بہادُر شاہ کے ساتھ بھی ہُوا۔ وہ کسی طرح بھی ان ہنگاموں اور قتل و غارت گری میں شریک نہ تھے۔ اور ایک بہادُر شاہ ہی پر کیا موقوف ہے، کوئی بھی اعتدال پسند، سنجیدہ اور نیک دل شخص اس قسم کی خوں ریزی سے خوش نہ ہُوا ہو گا۔ مگر

انگریزوں کو، چونکہ مغل سلطنت کے اس آخری مرجھاتے ہوئے پودے کو جڑ سے اکھاڑنا مقصود تھا، اس لیے بہادر شاہ کو اس قتلِ عام کا ذمّہ دار قرار دیا گیا۔

بہرحال حقیقت یہی ہے کہ مشتعل فوجیوں اور شہریوں میں انتہا پسند اور جوشیلے لوگ پیش پیش تھے۔ اُدھر فوجیوں کا خیال تھا کہ جب تک ایک ایک انگریز کو چُن چُن کر قتل نہیں کیا جاتا، اس قوم سے ہندوستان کو چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ انگریزوں کے قتلِ عام میں جن لوگوں کا ہاتھ تھا، وہ نہ بہادر شاہ کے قابو میں تھے نہ کسی اور سردار یا حاکم کے۔ لوگوں کے جذبات کا تو یہ عالم تھا کہ اگر خود بہادر شاہ انھیں خوں ریزی سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تو شاید انھیں بھی اپنے وقار سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ ان حالات میں وہ بیچارے حیران و پریشان اِن تمام ناروا حرکتوں کو دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔

انگریزوں کی جدّوجہد

میرٹھ کی انگریزی فوج نے دہلی کے کمشنر کو پہلے ہی تمام واقعات سے تار کے ذریعے سے مطلع کر دیا تھا کہ سرکشوں کا رُخ دہلی کی طرف ہے۔ یہ تار فریزر تک رات ہی کو پہنچ گیا تھا، مگر اُس نے صبح کو پڑھا جب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور کسی احتیاطی تدبیر پر عمل نہ ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دہلی میں ہنگامہ ہُوا تو انگریز افسر دنگ رہ گئے۔ وہ ابھی خواب غفلت سے بیدار بھی نہ ہو پائے تھے کہ ان میں سے بیشتر کو قتل کر دیا گیا اور دہلی پُوری طرح سرکش فوج کے قبضے میں آ گئی۔ اُس وقت شہر کی حالت دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا کہ اس سرزمین سے انگریزی تسلّط ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ مگر حالات اس کے برعکس تھے۔

انگریزی فوج کی بڑی تعداد گرمی کی وجہ سے شملے میں تھی۔ کمانڈر انچیف جنرل این سن بھی وہیں تھا۔ دہلی کے واقعات کی اطلاع ملتے ہی اُس نے سب سے پہلے پنجاب کے میگزینوں کی حفاظت کا انتظام کیا۔ ۱۴ رمئی کو روانہ ہو کر وہ ۱۵ رمئی کی صبح کو انبالے پہنچ گیا۔ اس عرصے میں نور پور اور کانگڑہ

کی فوجوں اور گورکھا پلٹن کو انبالہ پہنچنے کا حکم دے دیا گیا۔ اس موقع پر پنجاب کی سکھ ریاستوں کے تعاون نے انگریزوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا۔ خصوصاً جیند اور پٹیالے کے راجا خیر خواہی میں پیش پیش تھے۔ اُنھوں نے ہر طرح سے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ فوجی امداد کے علاوہ وہ تمام سہولتیں بھی مہیا کیں، جو بڑے لشکر کی پیش قدمی کے لیے ضروری تھیں ـــ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انگریزوں کے اُکھڑے ہوئے قدم سکھ قوم نے اتنی مضبوطی سے پکڑ لیے تھے کہ وہ پیچھے نہ ہٹ سکے۔ اس غیر معمولی امداد اور بروقت تعاون نے انھیں اتنی فرصت دے دی کہ وہ اپنی بکھری ہوئی طاقت اور منتشر افواج کو اکٹھا کر سکیں اور یکسوئی سے دہلی پر حملہ آور ہو سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سکھ ریاستیں مسلمان حکومت کو پسند نہ کرتی تھیں۔ ان حکمرانوں کی سب سے بڑی نادانی یہ تھی کہ انگریز قوم کی سیاست اور عیّاری کا تلخ تجربہ ہونے کے باوجود اُنھیں یقین تھا کہ اگر ان کی مدد سے انگریزوں کو کامیابی ہو گئی تو وہ سکھوں کو دہلی کی حکومت بخش دیں گے۔ حالانکہ دہلی کا تخت اگر کسی دیسی قوم ہی کے پاس رکھنا ہوتا تو انگریزوں کے لیے وہ نحیف و نزار بادشاہ ہی کیا بُرا تھا، جس کے کمزور ہاتھوں میں تلوار پکڑنے کی سکت بھی نہیں تھی ـــ اس خوش فہمی اور خام خیالی پر جتنا بھی تعجب کیا جائے وہ کم ہے۔ کیونکہ سکھ حکمران انگریزوں کے مزاج اور ان کی شاطرانہ چالوں کا مزا پہلے بھی چکھ چکے تھے۔ کچھ ہی عرصہ پیشتر اسی قوم نے سکھ ریاستوں

میں پھوٹ ڈلوا کر ان کے آپس میں لڑنے کا تماشا دیکھا تھا، پھر بھی ان احمق حکمرانوں نے ان کی باتوں میں آکر اپنی قوم کے دامن پر ملک کی غداری کا داغ لگا دیا۔

ان کی دیکھا دیکھی کرنال کے نواب نے بھی دل کھول کر انگریزوں کا ساتھ دیا۔ چونکہ یہ ریاستیں اُس علاقے میں واقع تھیں، جہاں انگریزی فوجیں بکھری ہوئی تھیں، اس لیے اُن کی اعانت یا خاموشی برِصغیر کے پیروں میں پڑی ہوئی غلامی کی زنجیریں توڑنے میں بڑی مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ مگر اِس کے برعکس اُنھوں نے انگریزوں کو بے تحاشا فوجیں، خزانہ، سامانِ جنگ اور باربرداری کی سہولتیں مہیا کیں۔ دہلی کی طرف سے ان ریاستوں کا تعاوُن حاصل کرنے کے لیے جو لوگ بھیجے گئے اُنھیں قتل کر دیا گیا۔

انگریزوں کی بکھری ہوئی فوجیں اب گردو در گردہ آکر انبالے میں جمع ہو گئیں تو این سن نے سامانِ جنگ فراہم کر کے کچھ فوج کو کرنال کی طرف بھیج دیا۔ چونکہ دہلی میں باغی فوج زیادہ تھی اور اُنھیں شہریوں کی حمایت بھی حاصل تھی، اس لیے تھوڑی سی فوج سے دہلی پر حملہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

جب پٹیالے کے راجا نے تھانیسر والی سڑک اور جیند کے راجا نے پانی پت کے مورچے کی حفاظت کا ذمّہ لے لیا تو اُدھر سے مطمئن ہو کر این سن دہلی اور میرٹھ کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے تین الگ الگ رسالوں کے ساتھ دہلی پر حملہ کرنے کی تیاری کی تھی۔ یہ تینوں رسالے تین ہزار گوروں اور ایک ہزار دیسی سپاہیوں پر مشتمل تھے۔ ان کے علاوہ بائیس میدانی توپیں

بھی ان کے ساتھ تھیں۔

جنرل این سن دورانِ سفر میں ہیضے کا شکار ہو گیا۔ کرنال پہنچتے پہنچتے اُس کی حالت خراب ہو گئی۔ جب زندگی کی اُمید نہ رہی تو اُس نے مہم کی کمان سر ہنری برنارڈ کو سونپ دی، جو انبالہ سے کرنال پہنچ گیا تھا۔

انگریز قوم کے لیے یہ وقت بڑا صبر آزما تھا۔ ایک تجربہ کار افسر کا بے وقت مر جانا کسی آفتِ ناگہانی سے کم نہ تھا۔ اب برنارڈ کی جرأت کی آزمائش کا موقع تھا۔ وہ اس امتحان میں پورا اُترا۔ برنارڈ این سن کی موت سے دلگیر ہُوا نہ بڑی توپوں کی کمی سے فکرمند ہُوا، بلکہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اُس نے فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔ اس کے حوصلے اور تدبّر کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اُس کے کرنال پہنچنے، این سن کے مرنے اور فوجوں کی روانگی کی ایک ہی تاریخ یعنی ۲۷ مئی تھی۔ یہ لشکر ۳۰ مئی کو غازی آباد پہنچ گیا۔

اُدھر حریت پسندوں کے جوش و خروش میں اگرچہ روز بروز اضافہ ہو رہا تھا مگر ایک جذبۂ آزادی کے سوا کوئی ایسی طاقت نہ تھی، جس سے انگریزوں کے حملے کو روکا جاتا۔ اُنھیں یہ اندازہ بھی نہ تھا کہ کل کیا ہوگا۔ آئندہ کے لیے پروگرام بنانے اور اُس پہ باقاعدگی سے عمل کرنے کا ہوش کسی کو نہ تھا۔

دُنیا کی تمام بڑی بڑی لڑائیوں میں کامیابی کا انحصار چار چیزوں پر رہا ہے جان نثار فوج، مددگار عوام، اعلیٰ مقصد اور جرأت مند قیادت۔ اُس وقت کے حالات کا گہرا مُطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ محض جرأت مند اور اندرُونی سازشوں سے پاک قیادت کی عدم موجُودگی

ـنے اس سرزمین کو مزید نوّے سال کے لیے غلام بنا دیا۔ اس جدّ و جہد میں عوام اور فوج کے حوصلے بے حد بلند تھے۔ ان کے پاس ایک اعلیٰ مقصد بھی تھا۔ اپنے مذہب، ثقافت، اور تہذیب کے تحفظ سے بڑھ کر کون سا جذبہ ہو سکتا ہے جو انسانوں کو جنگ کا ایندھن بلنے پر مجبور کر دے۔ اُن کے دل قومی حمیت سے سرشار تھے۔ وہ بدیسیوں کے ہاتھ سے اپنے وطن کو چھیننے کے لیے بے چین تھے۔ مُلک کی دونوں بڑی قومیں خود کو انگریزی عملداری میں غیر محفوظ سمجھتی تھیں۔ وہ اس قوم کے جانی دشمن تھیں، جس نے ان کی ثقافت کو مجروح کیا تھا، اُن کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی، گھریلو صنعتوں کو ختم کر کے اُنھیں بے روزگار کر دیا تھا اور جو اُنھیں بہت ذلیل اور پست سمجھتی تھی۔ کسی تحریک کی کامیابی کے لیے اس سے بڑھ کر کون سے اسباب ہو سکتے ہیں۔

غرض اعلیٰ قیادت اور بہتر اسلحہ کے سوا ہر چیز موجود تھی۔ محاذِ آزادی میں صرف ایک ایسے انسان کی کمی تھی جو ایک اشارے سے انسانوں کے اس سمندر کا رُخ جدھر چاہتا اُدھر موڑ دیتا۔ یوں تو اس تحریک کے راہنماؤں میں چھوٹے بڑے نوّاب، جاگیردار، عُلما، ہندوؤں کے مذہبی راہنما اور عوامی نمائندے سب ہی تھے مگر اُن سب کی نظریں جس مرکز پر لگی تھیں وہ لال قلعہ تھا جس کے گرد غدّاروں اور سازشیوں نے جال بچھا رکھا تھا۔ یہی فتنہ پرور بہادر شاہ کی کوششوں میں رخنہ اندازی کرتے اور جنرل بخت خان کی محنت پر پانی پھیرتے رہتے۔ اُن کے علاوہ شہزادوں کی حماقت اور باہمی

رقابت نے بھی بخت خان جیسے اُلوالعزم جنرل کو ناکارہ بنا دیا تھا۔

غازی آباد میں انگریزی فوج کی آمد سے پہلے ہی حرّیت پسندوں نے ایک مناسب جگہ پر مورچہ بنا رکھا تھا۔ اور دشمن ابھی پُوری طرح مسلّح بھی نہ ہو پایا تھا کہ مقابلہ شروع ہو گیا۔ دونوں طرف سے سخت گولہ باری ہوئی۔ محاذِ آزادی کے توپ خانے کی کارکردگی یہاں نسبتاً بہتر تھی۔ تاہم نتیجہ انگریزوں کے حق میں رہا اور حرّیت پسندوں کو کچھ سامانِ جنگ چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا۔

دُوسرے دن زیادہ شدید معرکہ ہُوا۔ دونوں طرف سے دیر تک گولہ باری ہوتی رہی۔ اس مقابلے میں حرّیت پسندوں کو فتح کی قوی اُمید تھی مگر سالارِ فوج میرزا ابوبکر کی پست ہمّتی نے فتح کو شکست میں بدل دیا۔ بزدل شہزادہ گولہ باری سے خوفزدہ ہو کر شہر کی طرف بھاگ کھڑا ہُوا۔ اُسے بھاگتا دیکھ کر فوج کے بھی پیر اُکھڑ گئے اور شکست کی کوئی معقول وجہ نہ ہوتے ہوئے بھی تمام سپاہی شہزادے کے پیچھے بھاگنے لگے۔

دہلی کے فوجیوں کو ان لوگوں کی بزدلی پر سخت طیش آیا اور اُنھوں نے بھگوڑوں کے لیے شہر کے دروازے بند کر دیے۔ اسی بھگدڑ میں پُل ٹُوٹ گیا۔ بہت سے سپاہی ڈُوب کر مر گئے اور باقیوں نے بھاگ کر جان بچائی۔ اس افسوسناک شکست سے انگریزی فوج کے حوصلے بڑھ گئے اور بھاگنے والی فوج کا سامانِ جنگ بھی مل گیا۔

دو مرتبہ پسپا ہونے کے بعد چند روز خاموشی طاری رہی۔ اس عرصے میں انگریزی فوج کو تازہ دم ہونے کا موقع مل گیا۔ یکم جُون کو گورکھا فوج بھی

ان کی مدد کو پہنچ گئی تو دشمن کا محاذ بہت مضبوط ہو گیا۔

۴ر جون کو اطلاع ملی کہ برنارڈ علی پور پہنچ گیا ہے۔ اب جنرل ولسن کے لیے ضروری تھا کہ آگے بڑھ کر برنارڈ سے جا ملے۔ پھر بھی مصلحتاً اُس کی فوج نے ۶ر جون تک حرکت نہ کی۔ جب ۶ر جون کو محاصرے کے لیے توپیں اور دیگر ضروری سامان بھی آ گیا تو ولسن نے دریا پار کر لیا۔ اُدھر برنارڈ نے بھی پیش قدمی کی۔ علی پور سے نکل کر باڈلی کی سرائے کا معرکہ ہُوا۔

باڈلی کی سرائے ایک مضبوط قلعے کی طرح تھی۔ اُس کے چاروں طرف مضبوط دیواروں کا حصار تھا۔ کرنال، پانی پت اور علی پور سے دہلی کی طرف جانے والی سڑک کے بائیں جانب یہ سرائے واقع تھی۔

حریّت پسند اس جگہ کی اہمیّت سے واقف تھے۔ انھیں پہلے سے اِطّلاع مل چکی تھی کہ پنجاب کی سکھ ریاستیں انگریزوں کی بہی خواہ ہیں اور اُن کا ساتھ دے رہی ہیں۔ ان حالات میں کسی وقت بھی انبالے کی طرف سے حملہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس سرائے کو ایک مضبوط مورچہ بنانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔

دہلی کی فوج جنگ کے طور طریقوں سے انگریزوں کی طرح واقف نہ تھی۔ تاہم اُس نے سرائے سے کچھ فاصلے پر ریت کے بورے لگا کر ایک مورچہ بنا لیا تھا۔ اس کے علاوہ سڑک کے دونوں طرف پڑے ہوئے گڑھوں کو دشمن کی پیش قدمی کے لیے خطرناک سمجھ لیا گیا تھا۔

اس معرکے میں دہلی کی فوج بڑی جُرأت اور ہمّت سے لڑی۔ مقابلہ اگرچہ تھوڑی

ہی دیر رہا مگر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ انگریزوں کے پاس کہیں بہتر اسلحہ اور توپ خانہ تھا۔ ان کی توپوں نے دہلی کی فوج کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اس کی چھوڑی ہوئی توپوں پر بھی دشمن نے قبضہ کر لیا۔

اب انگریزوں نے اپنی فوج کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے ہر دو جانب روانہ کر دیا تاکہ گھوم کر دہلی کی فوج پر حملہ کریں۔ بہت دیر کے بعد دونوں دستے ایک ساتھ نمودار ہوئے اور اِس طرح دہلی کی فوج کو بہت نقصان اُٹھانا پڑا۔ ۸ جون کو یہ محاذ بھی انگریزوں نے جیت لیا۔

اگر اُس وقت انگریزی فوج ذرا بھی سُستی سے کام لیتی تو اُن کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا۔ چنانچہ برنارڈ نے اپنی فوج کی پیش قدمی کو جاری رکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حرّیت پسندوں کو تازہ دم ہونے یا ایک جگہ اکٹّھا ہونے کا موقع نہ ملے۔ اس مقصد کے لیے سب سے بڑا مسئلہ دہلی کے محاصرے کا تھا۔ چنانچہ افسران نے مشورہ کر کے فوج کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ ایک حِصّہ پہاڑی کی طرف سے انگریزی چھاؤنی کی طرف بڑھا، دُوسرا سبزی منڈی کی طرف روانہ ہُوا۔

بہادر شاہ

مُعاشی ترقّی، ملکی استحکام، انصاف اور بہتر نظم و نسق انھی ملکوں میں ہو سکتا ہے جہاں دو تین پشتوں سے مستحکم حکومت قائم ہو یا پھر حکمران میں ایسے ذاتی جوہر ہوں کہ وہ ملک کو درپیش مسائل پر اپنے حسنِ تدبیر اور جرأت سے قابو پا سکے۔ پہلی صُورت میں اگر بادشاہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک نہ ہو، تب بھی ملک ابتری کا شکار نہیں ہوتا۔ کیونکہ شاہی رُعب و داب مُلک کے گوشے گوشے پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ دربار مستعد، وفادار اور جرأت مند امیروں وزیروں سے بھرا ہوتا ہے اور ہر محکمے کے اہل کار اپنے اپنے فرائضِ منصبی کو تسلّی بخش طور پر انجام دیتے رہتے ہیں۔

بدقسمتی سے بہادر شاہ اُس نعمت سے محرُوم تھا جسے شاہانہ اقبال مندی کہتے ہیں۔ مُغل حکومت کئی پشتوں سے محض نمائشی رہ گئی تھی۔ چُونکہ بادشاہ کا گزارہ انگریزی وظیفے پر تھا، اس لیے دربار کے اُمرا اور خود شاہی خاندان کے لوگوں میں اُس کی کوئی وقعت اور اہمیّت نہ تھی۔ یُوں تو وہ تمام لوگ بہادر شاہ کے سامنے قدیم آدابِ شاہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُسے ظلِّ الٰہی، جہاں پناہ، عالم پناہ اور شہنشاہِ

ہندوستان کے خطابات سے نوازتے تھے ۔ مگر یہ سب پُرانی رسموں کی پاس داری تھی ۔ ورنہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بادشاہ کو کتنے اختیارات حاصل ہیں ۔ صحیح صورتِ حال یہ تھی کہ بہادرُشاہ کے گرد چند خوشامدی ، خودسر، مفاد پرست اور انگریزوں کے ایجنٹ جمع تھے ۔

ان حالات میں میرٹھ کی فوج کے دہلی میں داخل ہونے سے پہلے اگر بہادرُشاہ کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے تو اُنھیں قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا ۔ البتہ آزادی اور خُود مُختاری کی مختصر مُدّت یعنی چار ماہ دس دن میں جو کارروائیاں کیں ، اُن سے ان کے ذاتی جوہر اور اعلیٰ صفات کا پتا چلتا ہے ۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ اُن چند در چند مصائب اور مُشکلات کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے جن سے بہادرُشاہ اس عرصے میں دوچار رہے ۔

اس مختصر عرصے میں دہلی کے سیاسی ، سماجی ، فرقہ دارانہ ، اقتصادی اور فوجی مسائل زبردست طوفانی موجوں کی طرح بہادرُشاہ پر یلغار کرتے رہے ۔ ان تمام مسائل کی نوعیت اور کیفیت جُدا جُدا تھی ۔ ایک طرف انھیں نہایت عیّار ، فنونِ جنگ سے واقف اور جدید اسلحہ سے لیس منظم دُشمن کا سامنا تھا ، دُوسری طرف اندرُونی انتشار نقطۂ عروج تک پہنچ چُکا تھا ۔ خزانہ بالکل خالی تھا ۔ ذرائع آمدنی معدُوم تھے ۔ اگرچہ فوج حبِّ وطن اور انگریز دُشمنی کے جذبات سے سرشار تھی ، مگر یہ جذبات نہ روٹی کی جگہ کھائے جاسکتے تھے ، نہ اُن سے بچّوں کی پرورش ہوسکتی تھی ۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فوج تنخواہ کے بغیر کب تک گزارہ کرسکتی تھی ۔ نتیجے میں سپاہیوں میں بے چینی پیدا ہونے لگی ۔ اس عرصے میں بعض تیز مزاج فوجیوں سے کچھ

بے اعتدالیاں بھی سرزد ہوئیں، مگر بادشاہ کو مجبوراً چشم پوشی سے کام لینا پڑا۔ اس قسم کے واقعات بار بار ہوئے تو شہری فوج سے بدظن ہو گئے۔ شہریوں کی بے چینی نے غدّاروں اور جاسوسوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ محاذِ آزادی کی تمام اہم خبریں دشمن تک پہنچنے لگیں۔ جب انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ اندر ہی اندر سُلگنے والی آگ محاذِ آزادی کو جلا رہی ہے تو اُنھوں نے محاصرے کو طُول دے دیا۔

زوال پذیر معاشرے میں صاحبِ حیثیت طبقہ عیش و آرام کا عادی ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ مقصد کے حصُول کی خاطر جو قربانیاں لازم ہوتی ہیں، وہ اُن کے تصوّر سے بھی گھبرانے لگتا ہے۔ جب کوئی صبر آزما دَور آتا ہے تو یہی تعیّش پسند اور آرام طلب لوگ عوامی تحریک سے الگ تھلگ رہنے کی سوچنے لگتے ہیں تاکہ عوام کے دوش بدوش چلتے ہوئے اُنھیں نت نئے مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

بعض مؤرخ ان بزدلوں اور بدنصیبوں کے زمرے میں زینت محل کا نام بھی لیتے ہیں۔ یہ مؤرخ اگر انگریزوں سے ساز باز نہیں رکھتے تھے تو کم از کم اُن سے دشمنی مول لینے کو بھی تیار نہ تھے۔ اس کے علاوہ دربار میں کئی سرکردہ ہستیاں ایسی بھی تھیں، جو دل سے تحریک کے ساتھ نہ تھیں۔ مرزا الٰہی بخش جیسے بعض بااختیار لوگ انگریزوں سے خفیہ نامہ و پیام کا سلسلہ بھی قائم کیے ہوئے تھے۔ محاذِ آزادی کے خلاف سازش اور جاسوسی کی زنجیر کا ایک سرا مرزا الٰہی بخش اور دُوسرا منشی رجب علی کے ہاتھ میں تھا، جو بے حد خود غرض، عیّار اور شاطر

انسان تھا۔ دہلی میں جو خفیہ تنظیم انگریزی حکومت کی بحالی کے لیے جاسوسی کا کام کر رہی تھی، وہ اُس کا سرغنہ تھا۔ انگریزوں میں مرزا الٰہی بخش کا رسوخ بھی اُسی نے بڑھایا تھا۔ نیز ہر طرح کی سازش اور سازباز کا وہی ذمّہ دار تھا۔ وہ بہ یک وقت مخبری کے فرائض بھی انجام دیتا اور دہلی کی سپاہ اور مخلص امراء کے درمیان اختلاف کا بیج بھی بوتا تھا۔ اس نے اپنی غیر معمولی شاطرانہ چالوں سے بڑے بڑے دیانت دار لوگوں کی طرف سے عوام اور فوج کو بدظن کر دیا۔ صاحبِ اختیار لوگوں میں جس شخص کو مخلص اور ایماندار پاتا اُسی کے بارے میں جھوٹی باتیں لشکر میں پھیلاتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بیشتر فوجی دربارِ دہلی کے خلاف ہو گئے اور برملا کہنے لگے کہ بہادرشاہ کو ہٹا کر مرزا مغل یا کسی اور شہزادے کو بادشاہ بنا دیا جائے۔

بہادرشاہ اپنی نوجوان بیوی بیگم زینت محل کے زیرِ اثر تھے۔ چونکہ خود زینت محل صاحب رائے خاتون نہ تھی اس لیے وہ مرزا الٰہی بخش کے مشوروں پر عمل کرتی تھی۔ اسی توسّط سے مرزا الٰہی بخش اور رجب علی کی مفسدانہ تجویزیں بہادرشاہ تک پہنچتی تھیں۔

ضعیفی اور حالات کی مجبوری نے بادشاہ کو اتنا بے اثر بنا دیا تھا کہ وہ خاندانی معاملات میں بھی اپنی مرضی کے مطابق کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔ اُن کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ شاہی خاندان کے نالائق افراد بعض ذمّہ دار اور اہم عہدوں پر قابض ہو گئے تھے مگر وہ اندرونی خلفشار کے ڈر سے کچھ نہ کر سکے۔ کلیدی عہدوں پر ان مجہول افراد کے فائز ہونے سے بھی تنظیم کی کارکردگی

بُری طرح متاثّر ہوئی ۔

یہ حقیقت بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ مُغل شہزادے تیغوں کے سائے میں پل کر جوان نہیں ہُوئے تھے۔ اُنھوں نے ہوش سنبھال کر نہ خود تخت و تاج کی خاطر جنگ کی تھی ، نہ اپنے کسی بُزرگ کو شاہی وقار کے تحفظ کے لیے دُشمن سے لڑتے دیکھا تھا اور بدقسمتی سے مُلک کے کسی چھوٹے سے حصّے کا اِنتظام بھی نہ سنبھالا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں انتظامی صلاحیّت کا فقدان تھا اور وہ تدبّر، شجاعت اور فراست کی عملی شکلوں سے ناواقف تھے۔ ذاتی طور پر جفاکش، محنتی اور سپاہیانہ جوہر کے مالک بھی نہ تھے ، اس لیے فوج پر بھی اُن کا کوئی اثر نہ تھا۔ دہلی میں مختلف علاقوں، صوبوں اور شہروں کے سپاہی جمع تھے۔ وہ سب ایک ایسے سپہ سالار کے سامنے سر جُھکا سکتے تھے جو خُود بھی بہادُر، عالی حوصلہ اور بُردبار ہو۔ قلعے کے اندر رہ کر ناز و نعم میں پلے ہوئے شہزادے ، جن کی عُمریں مشاعرے کراتے اور رقص و سرود کی محفلیں گرم کرتے گزری تھیں، سرفروشی کی اِس مہم میں اگر کوئی اعلیٰ کردار ادا نہ کر سکے تو اس میں اُن کا قصوُر نہیں۔ اُن کے لیے یہی بات کچھ کم باعثِ فخر نہیں کہ اپنی عُمر کا بیشتر حصّہ قلعے کے گھُٹے گھُٹے سازشی ماحول میں گزارنے کے بعد بھی جب اُن کی عزّت پر بن آئی تو اُنھوں نے تلوار اُٹھانے سے گریز نہ کیا۔

غرض بہادُر شاہ کی شخصیّت مُختلف الخیال ساتھیوں اور متضاد نظریات رکھنے والے امیروں اور درباریوں میں گھری ہُوئی تھی۔ ان میں سے ہر ایک

انھیں اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا، مگر جس جوہر کی بہادر شاہ کو ضرورت
تھی وہ کسی کے پاس نہ تھا۔

قلعے کے باہر شہر میں قدم قدم پر نت نئے مسائل تھے۔ ان میں سے ایک
ایک مسئلے کے حل میں بے شمار پیچیدگیاں حائل تھیں۔ ایک نحیف و نزار تنہا
انسان پر بیک وقت ہر طرف مشکلات کی یلغار تھی۔ ان سب کے علاوہ شہر
کے باہر مستعد، چالاک اور طاقت ور دشمن اپنی فوجیں لیے پڑا تھا۔

اس پُرآشوب دَور میں بہادرشاہ کا آخری سہارا وہ جاں نثار سپاہی
تھے جو ہندوستان کے مُختلف حصّوں سے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر محض اُن
کے تخت کی حفاظت کے لیے آ آ کر دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔ مگر دہلی میں
وسائل کی کمی نے اُنھیں بھی دل برداشتہ کر دیا تھا۔ یہ لشکر کسی ایک سپہ سالار کے
ماتحت نہ تھا بلکہ مُختلف گروہوں میں بٹا ہُوا تھا۔ کچھ ایسے گروہ بھی تھے جن کا
کوئی سردار نہ تھا۔ اُن میں کسی طرح کی تنظیم اور ترتیب بھی نہ تھی۔

جب بادشاہ کے مقابلے میں فوج کی یا رہنما کے مقابلے میں عوام
کی طاقت بڑھ جاتی ہے تو حکومت یا پارٹی بدنظمی اور بے ترتیبی کا شکار ہو
جاتی ہے۔ کچھ یہی حال اُس وقت دہلی کا تھا۔ جب تک سپاہی شہر میں داخل
نہ ہوئے تھے اور لال قلعے کو اندر سے نہ دیکھا تھا اس وقت تک وہ اس کے
لیے اپنے دلوں میں بڑا احترام رکھتے تھے۔ مگر جب وہ شہر میں گھوم پھر کر دربار
دہلی اور شہر کی کمزوریوں سے واقف ہو گئے تو اُن کے دل میں وہ احترام نہ
رہا۔ شہریوں میں پھیلی ہُوئی طرح طرح کی افواہوں نے بھی اُنھیں بد دل کر دیا

تھا۔ دہلی سے انگریزوں کا نام ونشان مٹا دینے کے بعد اُنھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ دہلی کا تخت و تاج اُن کی چمکتی ہوئی تلوار کے سائے میں ہے۔

تحریکِ آزادی کا سب سے نامور سپاہی بخت خان تھا۔ اُس کے اندر وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک صاحبِ عزم سپہ سالار میں ہوتی ہیں۔ اُس کی اپنی فوج تنخواہ کی بھوکی بھی نہ تھی، کیونکہ اُس نے پہلے ہی اُن میں چھ ماہ کی تنخواہ تقسیم کر دی تھی۔ اُس کے پاس فوجی ساز و سامان بھی تھا اور نقد سرمایہ بھی۔ بلکہ اُس نے کچھ رقم شاہی خزانے میں بھی جمع کی تھی۔ جنگ جوئی کے ساتھ ساتھ وہ انتظامی سوجھ بوجھ بھی رکھتا تھا۔ اُس کی خوبیاں دیکھ کر بہادر شاہ نے اُسے تمام فوجوں کا سپہ سالار بنا دیا تھا مگر خود غرض اُمرا اور کج فہم شہزادے کب گوارا کر سکتے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے بخت خان کو بہادر شاہ کے بعد پورے پورے اختیارات حاصل ہوں۔ وہ تو سپہ سالاری اور حکمرانی کو اپنا موروثی حق سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے بخت خان کی کارکردگی میں طرح طرح کی رخنہ اندازی کی۔ بادشاہ کے سامنے اُس کے اچھے کاموں کو بھی بگاڑ کر پیش کیا۔ اُن کے اشارے پر مصاحبوں نے بادشاہ کے سامنے بخت خان کے خلاف شکایات کا دفتر کھول دیا اور طرح طرح سے یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ فوج کا ایک معتدبہ حصّہ بخت خان کی ماتحتی میں کام کرنے کو تیار نہیں اور اُس پر مرزا مُغل کو ترجیح دیتا ہے۔ ان بدقسمت لوگوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بخت خان کوئی کام خوش اسلوبی سے انجام نہ دے سکا۔

یُوں تو ہندوستان کے مُختلف علاقوں سے بادشاہ کے حضُور میں اظہارِ اطاعت کے لیے عرضیاں اور قاصد آنے لگے تھے۔ کہیں کہیں سے فوج بھی آئی تھی۔ بعض مقامات مثلاً حصار، بجنور، بریلی، ساگر، لدھیانہ، جھانسی، الٰہ آباد، بُلند شہر اور متھرا وغیرہ سے نقد رقم بھی طلب کی گئی تھی مگر اتنی بڑی جنگ کے لیے جتنے سرمائے کی ضرورت تھی وہ مہیّا نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ ملک کی کسی بڑی ریاست نے بھی کھُل کر حمایت نہیں کی تھی بلکہ راجپوتانے کی ریاستوں نے انگریزوں کے ساتھ ساتھ بہادرُ شاہ سے بھی سرد مہری برتی تھی۔ مُلک کے بیشتر حُکمران اُس پُرآشوب دَور میں اپنی ریاست کے اندرُونی مسائل میں اس طرح اُلجھے ہوئے تھے کہ اُنھیں دہلی کی طرف نظر اٹھانے کی بھی مُہلت نہ تھی۔ جو لوگ نسبتاً مطمئن زندگی گزار رہے تھے وہ یہی دیکھتے رہے کہ بہادرُ شاہ اور انگریزوں میں کس کا پلّہ بھاری رہتا ہے تاکہ اُسی کا کھُل کر ساتھ دیا جائے۔ بظاہر وہ بہادرُ شاہ کے لیے زبانی اور تحریری طور پر اظہارِ اطاعت کرتے رہے مگر اس قسم کی وفاداری سے نہ بہادرُ شاہ کو فائدہ پہنچا نہ تحریک کو کوئی تقویّت ملی۔

بہرحال ان تمام بدنظمیوں، خرابیوں اور اِنتشار کے باوجود بہادرُ شاہ نے حتیّ المقدُور حالات کو قابُو میں رکھنے اور تحریک کو آگے چلانے کی کوشش کی۔ ذاتی طور پر وہ بے حد رحم دل، نرم مزاج اور خوش اخلاق تھے، اسی لیے اپنے قریبی حلقے میں بہت ہردلعزیز اور مقبُول تھے۔ وہ اپنے ملازمین سے بھی بڑی نرمی اور محبّت سے پیش آتے۔ کوئی اپاہج یا

معذور ہو جاتا تو اُسے برطرف نہ کرتے بلکہ مرنے کے بعد بھی اُس کے بچوں کا وظیفہ جاری رکھتے۔

بہادر شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خود مختاری کے اس مختصر دورِ حکومت میں بھی عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے عدلیہ کا تمام انتظام مُفتی اور صدرُالصدور کے سپرد کیا اور حکم دیا کہ فوج یا دیوانی کے افسر عدلیہ کے کسی کام میں دخل نہ دیں۔ انتظامیہ کو درست کرنے کے لیے انھوں نے نئے تقرر اور تبدیلیاں کیں۔ جنرل بخت خان کو گورنر جنرل نامزد کیا۔ مولوی لیاقت علی کو الہ آباد، خان بہادر خاں کو روہیلکھنڈ، ڈاکٹر وزیر خاں کو آگرہ اور ولی داد خاں کو بلند شہر کا حاکم مقرّر کیا۔ دہلی میں کوتوال شہر کا عہدہ پہلے قاضی فیض اللہ پھر سیّد مبارک شاہ رام پوری کو دیا گیا۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ تحصیلدار اور تھانے دار مقرّر ہوئے۔ گوڑگاؤں میں ذیلدار کا تقرر ہوا۔

بہادر شاہ نے ایک مجلسِ انتظامیہ بھی بنائی تھی جو دس افراد پر مشتمل تھی۔ ان میں سے چھ افراد فوج سے متعلّق تھے۔ پیادہ فوج، رسالے اور توپ خانے کے دو دو نمائندے الگ تھے۔ یہ مجلس فوج کا انتظام چلانے اور اُس کی کارکردگی کو نظر میں رکھنے کے لیے بنی تھی۔ چار افراد کے سپرد ملکی اور دیوانی انتظام تھا۔ یہ مجلس سپہ سالار کے ماتحت تھی، جس کی منظوری کے بغیر اُسے کوئی حکم صادر کرنے کا اختیار نہ تھا۔ مجلس اور

سپہ سالار کے درمیان جو اختلافی مسائل ہوتے اُن پر آخری فیصلے کا اختیار صرف بادشاہ کو تھا۔

لیکن شہر میں آئی ہوئی فوج میں بھی کچھ مفاد پرست اور لوٹ مار کرنے والے شامل ہو گئے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی گامی جان جیسے غنڈے بھی پیدا ہو گئے جو کھُل کر لوُٹ مار کرنے لگے۔ ان لوگوں سے جو بے اعتدالی سرزد ہوتی، اُس کی بدنامی فوج کے حصّے میں آتی۔ بہادر شاہ نے جب دیکھا کہ لوُٹ مار کے خوف سے شہریوں نے دکانیں بند کر دی ہیں اور کاروبار کو نقصان پہنچ رہا ہے تو انھوں نے ذاتی طور پر دلچسپی لے کر سپاہیوں سے اقرار لیا کہ آئندہ امنِ عامّہ کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت نہ کی جائے گی۔ اس معاہدے پر سپاہی ثابت قدم رہے تو اعتماد بحال ہو گیا اور بازار کھلنے لگے۔

مگر شکست خوردہ ذہنیت رکھنے والی قوم اکثر بڑے بڑے مسائل کو نظر انداز کر کے چھوٹی اور غیر ضروری باتوں پر آپس میں اُلجھ جایا کرتی ہے۔ چنانچہ جب تک انگریزوں سے مقابلہ رہا، تمام آبادی بلاتخصیص مذہب و فرقہ ہم خیال اور متحد رہی۔ جب شہر سے انگریزوں کا صفایا کر دیا گیا تو دشمن کے ایجنٹوں نے نئی نئی باتیں نکال کر اُس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی جو مغل حکمرانوں کے تدبّر اور عدل نے اس عظیم ملک کے مختلف فرقوں میں پیدا کر دیا تھا۔

بہادر شاہ نے بھی اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ہر طبقے اور فرقے کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی، مگر فرقہ پرستوں کی ریشہ دوانیوں نے اُن کی ہر کوشش کو غلط رنگ دیا۔ نتیجے میں اتفاق اور ہم آہنگی کی آخری طاقت بھی

کمزور پڑنے لگی۔

سب سے پہلے ہندوؤں کی طرف سے گائے کے ذبیحے پر اعتراض ہُوا۔ چونکہ فوج میں ہندو سپاہیوں کی اکثریت تھی اور بہادر شاہ اس ہم آہنگی کو ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتے تھے، اس لیے اُنھوں نے گائے کے ذبیحے کی ممانعت کر دی۔ اس حکم سے بعض مسلمانوں کو خیال ہُوا کہ اُن پر ہندوؤں کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ اندر ہی اندر بات بڑھتی رہی۔ بعض لوگوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ ہندوؤں کی اکثریت انگریزی راج کو پسند کرتی ہے۔ اس قسم کی افواہوں سے ہندو بدظن ہونے لگے۔ دونوں طرف غلط فہمی پیدا کرنے اور افواہیں پھیلانے کا کام وہ لوگ انجام دے رہے تھے جن کی انگریزوں سے سازباز تھی۔ مولوی محمد سعید کے محمدّی جھنڈا کھڑا کرنے سے بھی ہندوؤں کے شبہات کو تقویت پہنچی۔ ادھر بخت خان کے ایما پر عُلما نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ شائع کر دیا۔ اس طرح جہاں مسلمانوں کا جوش و خروش بڑھا وہاں ہندوؤں کے جذبات سرد پڑنے لگے۔ یہاں بھی بہادُر شاہ کی فراست کام آئی۔ اُنھوں نے بذاتِ خود فریقین کو سمجھا بجھا کر اُس آگ کو ٹھنڈا کیا جو اپنا ہی گھر جلانے پر تلے تھے۔

پھر بہادُر شاہ نے ڈھنڈورے کے الفاظ اور سکّے کی تحریر میں تبدیلی کر دی۔ ڈھنڈورے میں "حکم سرکار کمپنی کا" کے بجائے "حکم بادشاہ کا" کر دیا گیا۔

العرض بہادر شاہ کو دہلی کی تباہی اور حریّت پسندوں کی شکست کا ذمّہ دار قرار دینے سے پہلے مندرجہ بالا حالات اور مسائل کا سمجھنا ضروری ہے۔ اُس پُر آشوب

دَور میں جب کہ ہر طرف افراتفری ، بدنظمی ، انتشار اور بے جہتی کا دور دورہ ہو، کتنا ہی صاحبِ عزم حاکم کیوں نہ ہوتا، اس کی کامیابی مشکل تھی۔ تاریخ کے صفحات پر کئی المناک واقعات ملیں گے جن میں عوامی تحریکوں نے اپنی خطاکاریوں سے شکست کھائی، مگر اس ناکامی کا ذمہ دار کسی ایک شخص کو ٹھہرانا بے انصافی ہے۔ بہرصورت بہادر شاہ نے انتہائی نامساعد حالات میں شہر اور فوج کے انتظام کو درست رکھنے کی کوشش کی۔ یہ اور بات ہے کہ مسائل کی بہتات، سرمائے کی کمی، سرداروں، امیروں اور شہزادوں کی باہمی رقابت اور غداروں کی سازشوں نے اُن کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

انگریزی فوج کی حالت

دوسری طرف انگریزی فوج میں بھی سکون کے آثار نہ پائے جاتے تھے۔ انگریز حکّام شش و پنج میں مبتلا تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ شہر پر زبردست اور فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے یہ وقت مناسب ہے۔ مگر جو افسر زیادہ دُور اندیش اور محتاط تھے وہ پُوری تیاری کے بغیر بڑا حملہ کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جب تک عوام کا ایک حصّہ ساتھ نہ ہو، شہر پر دیر تک قبضہ رکھنا ناممکن ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنی مخصوص ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ ان کے جاسوس شہر میں جا جا کر متضاد افواہیں پھیلانے اور مختلف فرقوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

انگریزوں نے اپنے مورچے ۹ رجُون کو تیار کر لیے تھے۔ دہلی سے ڈھائی میل کے فاصلے پر ایک ساٹھ فٹ اُونچی پہاڑی کے پیچھے اُن کی چھاؤنی واقع تھی۔ یہ جگہ شہر سے قریب ہونے کی وجہ سے ہر وقت حرّیت پسندوں کے حملے کی زد میں تھی۔ اسی لیے برنارڈ نے یہاں سخت حفاظتی انتظامات کیے تھے۔ انگریزی فوج کا بڑا اڈ شمالی حصّے میں تھا۔ وہیں توپوں کا ایک مورچہ بنا دیا گیا تھا۔

اُس مورچے سے شہر کی فصیل تقریباً چھ فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ ایک طرف پہاڑی ڈھلان پر مارٹر توپیں لگا دی گئی تھیں۔ فلیگ سٹاف پر پیادہ سپاہیوں کی چوکی تھی۔ وہاں بھی دو توپیں نصب تھیں۔ ڈھلان سے کچھ فاصلے پر ہندو راؤ کی کوٹھی تھی، جس کی مضبوط دیواروں نے اُسے ایک مورچہ بنا دیا تھا۔

انگریز فوج کے وسائل بھی نسبتاً محدود تھے۔ اگر وہ دہلی پر بھرپور حملہ کر دیتی تو ناکامی کی صورت میں ایک انگریز کا بچنا بھی مشکل تھا کیونکہ ہزیمت اٹھانے کے بعد کوئی ایسا مورچہ نہ تھا جس کے سہارے بھاگ کر وہ ایک جگہ ٹھہر سکیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس فوج کی بھی کمی تھی۔ اگر انگریزی فوج بڑا حملہ کر کے مارتی کاٹتی شہر میں داخل بھی ہو جاتی تو اُس کا شہر کی تنگ فضا میں پھنس جانا یقینی تھا۔ اُن کے دو ڈھائی ہزار مسلح سپاہی اتنے بڑے شہر کے لیے ناکافی تھے۔ شہر کی آبادی اور فوج کے درمیان گھر جانے کی صورت میں بچ کر نکلنا بھی ممکن نہ تھا۔ ویسے بھی شہر کی عمارتیں حریت پسندوں کے لیے بہترین کمین گاہیں اور مورچے ثابت ہوتیں۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ بھرپور حملے کی صورت میں اگر اہلِ شہر کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا گیا تو تعداد میں زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ انگریزی مورچوں کو آناً فاناً تباہ کر دیں گے۔ وہاں اتنا ساز و سامان نہ تھا جو اہلِ شہر کی یلغار کا متحمل ہو سکتا۔

الغرض تمام فوجی افسر ۱۶ جون کو سر جوڑ کر بیٹھے اور کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے مشورہ کرنے لگے۔ جوشیلے لوگ حملہ کرنے کے لیے بے چین تھے۔ اُن کی دلیل

یہ تھی کہ تاخیر کی صورت میں ہندوستان کے تمام نواب، راجا اور عوام جو انگریزوں کے حامی ہیں اُن سے بدظن ہو جائیں گے۔ اور اُنھیں انگریزی لشکر کی کمزوری کا یقین ہو جائے گا۔ اگر اُن میں کچھ لوگ ٹوٹ کر بہادر شاہ کی طرف چلے گئے تو دشمن کی طاقت بڑھتی جائے گی۔ گرما گرم بحث کے بعد بھی اس میٹنگ میں کوئی اہم فیصلہ نہ ہو سکا۔

انگریزوں کے لیے یہ وقت بڑا کٹھن تھا۔ اُنھیں مخبروں نے اطلاع دی تھی کہ روہیلکھنڈ سے آئی ہوئی فوج جنرل بخت خان کی سرکردگی میں خود انگریزی مورچوں پر حملہ کرنے والی ہے۔ ادھر اُن کی رجمنٹوں میں بھی بے چینی پھیل گئی تھی۔ دیسی فوج اُن کی نظر میں بالکل قابلِ اعتماد نہ تھی۔

اِبتدائی حملے

انگریز افسر اس شش و پنج میں مبتلا تھے، مگر مجاہدین اُن کے مورچوں پر برابر چھوٹے بڑے حملے کرتے رہتے۔ یہ حملے ۹، ۱۰، ۱۱ اور ۱۲ رجون کو ہوئے۔ بہرحال ۱۷ رجون کو انگریزوں نے مٹکاف ہاؤس پر قبضہ کر لیا۔ وہاں سے عید گاہ کے مورچے پر حملہ کر کے اُسے درہم برہم کر دیا۔ یہ مورچہ ان کے لیے بے حد خطرناک تھا۔ وہاں سے حملے کی صورت میں اُن کے لشکر کو بے حد نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ ۲۳ رجون کو مجاہدین نے بڑا شدید حملہ کیا۔ وہ جنگِ پلاسی کی صد سالہ برسی کا دن تھا۔

۳ رجولائی کو برنارڈ کے پاس کچھ تازہ دم فوج آگئی۔ مگر اب بھی وہ شہر پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اُسی رات کو بخت خان نے اس قافلے پر حملہ کیا، جو فیروزپور سے خزانہ اور رسد لے کر آ رہا تھا۔ یہاں کوئی بڑی لڑائی نہ ہوئی۔ معمولی مزاحمت

کے بعد بخت خان کو کچھ سامان مل گیا۔ مگر اس حملے نے انگریزوں کی پریشانی میں اضافہ کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اُن کے عقبی مورچے غیر محفوظ تھے اور اُدھر سے کسی وقت بھی بڑا حملہ ہو سکتا تھا۔ مجبوراً اُنھوں نے خود ہی تمام پُل توڑ دیے۔

اس عرصے میں برنارڈ ہیضے کا شکار ہو کر مر گیا۔ اُس کی جگہ ریڈ کو لشکر کی کمان ملی مگر اُس نے اپنی پست ہمّتی کی وجہ سے استعفاء دے دیا۔ اُس کے بعد ولسن سالارِ اعلیٰ بنا۔

۱۴؍ جولائی کو مجاہدین نے لڈلو کیسل پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح نے دشمن کو حواس باختہ کر دیا۔ اب افسر کھُل کر دو مخالف گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ کا اصرار تھا کہ اتنی بڑی فوج جو بلا وجہ شہر کے باہر پڑی ہے اُسے محاصرہ چھوڑ کر دوسرے چھوٹے بڑے مقامات پر چلا جانا چاہیئے تاکہ اردگرد کے علاقے پر پوری طرح قابو پانے کے بعد دہلی پر حملہ کیا جائے۔

مگر محاصرہ قائم رہا۔ کیونکہ شہر کو گھیرے میں لیے رہنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ حریّت پسند دہلی ہی میں جمع رہے، جو اُن کا مرکز بن گیا تھا۔ دوسری صورت میں وہ اِدھر سے مطمئن ہو کر باقی ہندوستان میں جگہ جگہ پھیل جاتے اور ہر جگہ سے انگریزی راج کے داغ کھرچنے کی کوشش کرتے۔ اس کے علاوہ دہلی کے باہر پڑے رہ کر انگریزی فوج پنجاب کے وسائل سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھا رہی تھی۔ اس نے ان ریاستوں میں بھی اپنا بھرم قائم رکھا تھا جو اُس کی بہی خواہ تھیں۔

۷؍ اگست کو کسی طرح مجاہدین کے بارود خانے میں آگ لگ گئی۔ یہ ایک بہت بڑا کارخانہ تھا جو ایک حویلی میں واقع تھا، جس میں روزانہ تقریباً سات سو من بارود

تیار ہوتی تھی۔ آگ لگنے سے ایک زبردست دھماکا ہُوا اور کارخانے میں کام کرنے والے سینکڑوں آدمی جاں بحق ہو گئے۔ اس واقعے نے شہر میں ایک سنسنی پھیلا دی اور لوگوں کو غدّاروں اور جاسوسوں کی سرگرمیوں کا یقین ہو گیا۔

۲۵ راگست کو نجف گڑھ والا معرکہ ہُوا۔ مجاہدین کو اطلاع ملی تھی کہ دشمن کے لیے فیروزپور سے بڑی توپیں آ رہی ہیں۔ چنانچہ مجاہدین کا ایک دستہ ان توپوں پر قبضہ کرنے کی نیّت سے ۲۴ راگست کو آگے بڑھا۔ پالم پہنچ کر اس فوج کا ایک حصّہ نجف گڑھ چلا گیا۔ انگریزوں کی طرف سے نکلسن اس فوج کو روکنے کے لیے آیا تھا۔ اُس کے نجف گڑھ پہنچنے سے پہلے ہی مجاہدین مورچے بنا چکے تھے، مگر اُن کی فوج کا بڑا حصّہ ان سے کٹ چکا تھا۔ چند گھنٹوں کی جنگ کے بعد مجاہدین کو شکست ہو گئی۔ اس طرح انگریز فیروزپور کی توپوں کے ساتھ ساتھ اُن راستوں کو محفوظ کرنے میں کامیاب ہو گئے جن سے گزر کر سامان خورد نوش، اسلحہ اور دیگر ضروری چیزیں اُن تک پہنچتی تھیں۔

اس کے علاوہ انگریزوں کو محاصرے کے دوران دو چھوٹی چھوٹی کامیابیاں اور بھی ہوئیں۔ سب سے پہلے ہڈسن تھوڑی سی فوج لے کر رُہتک کی طرف بڑھا اور بشارت خان رسالدار کو شکست دے دی۔ اس کامیابی سے اُس کی ہمّت بڑھی تو اُس نے پیش قدمی کر کے دوسرے سردار بابر خان پر چڑھائی کر دی۔

بڑا حملہ

دہلی کے چاروں طرف تقریباً سات میل لمبی نہایت مضبوط فصیل تھی، جس پر بے شمار بُرج بنے ہوئے تھے۔ دشمن کی یلغار کو روکنے کے لیے یہ فصیل ہی کافی تھی، مگر اس کے باہر پچیس فٹ

گہری خندق تھی جو بیرونی حملے کے وقت دیوار کا کام دیتی تھی۔ شہر کے مشرق کی طرف دریا تھا جسے عبور کر کے حملہ کرنا مشکل تھا۔

جب دشمن کے پاس قلعہ شکن توپیں آگئیں تو حملے میں تاخیر کا کوئی سبب نہ رہا۔ چنانچہ طے پایا کہ شہر کے شمالی حصّے پر حملہ کیا جائے۔ ادھر سے بڑھنے کی صورت میں دشمن کی فوج ایک طرف دریا اور دوسری طرف ہندو راؤ کے مضبوط مورچے کی وجہ سے محفوظ ہو جاتی تھی۔ انگریزوں کی خوش قسمتی سے یہ حصّہ مجاہدین کی توجہ کا مرکز نہ بنا تھا۔

سب سے پہلے توپوں کے چار مورچے بنائے گئے۔ پہلا مورچہ ایک طرف موری دروازے اور دوسری طرف کشمیری دروازے کو اپنی زد میں لیے ہوئے تھا۔ دوسرا مورچہ قدسیہ باغ اور لڈلو کیسل کے قریب تھا۔ تیسرا مورچہ چُنگی خانے کی عمارت میں بنا۔ اس تیاری میں کئی انگریز کام آئے۔ چوتھا مورچہ قدسیہ باغ میں تھا۔

ایک ہی وقت میں چاروں مورچوں سے گولہ باری ہونے لگی۔ پہلے مورچے پر دوسری طرف سے شدید گولہ باری ہوئی۔ یہاں ریت کے بوروں میں آگ لگ جانے سے بڑی دِقّت پیش آئی۔

فصیل میں شگاف پڑ گئے تو چند افسروں کو یہ تحقیق کرنے کے لیے بھیجا گیا کہ ان شگافوں سے فوج اندر داخل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ مجاہدین کی گولہ باری نے ان لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ مجبوراً رات کو جب اچھی طرح شگافوں کی تصدیق ہو گئی تو حملے کا انتظام کیا گیا۔

اس حملے کے لیے جنرل نکلسن کی سرکردگی میں فوج کو پانچ حصّوں میں تقسیم کیا گیا۔

پہلا حصّہ ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا اور اسے کشمیری دروازے کے شگاف سے اندر داخل ہونا تھا۔

دوسرے حصّے کو اُس شگاف سے گزرنا تھا جو پانی والے مورچے کے قریب تھا۔ اس میں آٹھ سو پچاس آدمی تھے۔

تیسرے حصّے میں نو سو پچاس افراد تھے۔ یہ دستہ کرنل کیمبل کی سرکردگی میں تھا اور اسے اُس وقت کارروائی کرنا تھی جب کشمیری دروازہ اُڑا دیا جائے۔

چوتھا دستہ آٹھ سو آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس کے لیے حکم تھا کہ کشن گنج کی طرف سے لڑتا ہُوا لاہوری دروازے سے شہر میں داخل ہو۔

پانچواں کالم بریگیڈیر لانگ فیلڈ کی قیادت میں محفوظ رکھا گیا تھا۔

۱۴ ستمبر کو بڑا حملہ شروع ہُوا۔

حملے کے لیے یہ انتظام کیا گیا کہ پہلے اور دوسرے دستے کی طرف سے پیش قدمی ہو تو ایک دستہ جا کر کشمیری دروازے کو اُڑا دے۔ پھر وہاں سے آگے بڑھے۔ اندر داخل ہونے کے لیے ایک دستہ پہلے سے تیار ہو گا۔

پروگرام کے مطابق تمام فوج لڈلو کیسل کے پاس جا کر ٹھہر گئی۔ پہلا دستہ قدسیہ باغ پہنچ گیا۔ مجاہدین کی طرف سے شدید گولہ باری ہو رہی تھی۔ انگریزی فوج کو بے حد جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر سپاہی جان ہتھیلی پر رکھ کر

خندق سے گزر گئے۔ اب فوج کا دوسرا دستہ پانی والے مورچے کے شگاف سے آگے بڑھ گیا۔ کشمیری دروازہ اڑنے کی دیر تھی کہ تیسرا دستہ بھی اندر داخل ہو گیا۔ البتہ چوتھے دستے کو بری طرح شکست ہوئی۔ اُس کو لاہوری دروازے کی طرف بڑھنا تھا مگر اُس کی پیش قدمی رُک گئی۔ نکلسن بھی زخمی ہو گیا تھا۔ شام تک گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔ اس حد تک انگریزوں کو کامیابی ہو گئی کہ پانی والے مورچے سے کابلی دروازے تک فصیل سے ملحقہ علاقہ ان کے قبضے میں آ چکا تھا۔

ایک بار پھر انگریزی فوج کے افسروں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ ولسن آگے بڑھتی ہوئی فوج کو واپس بلانے کے حق میں تھا مگر دوسرے افسر کسی قیمت پر پیچھے ہٹنے اور فتح کو شکست میں تبدیل کرنے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ پہاڑی پر انگریزی فوج کے مورچے تھے۔ دوسری طرف کشمیری دروازے سے کابلی دروازے تک توپیں آگ برسا رہی تھیں۔ دن رات گولے برسائے جا رہے تھے اور سارا شہر ان دھماکوں سے ہل رہا تھا۔ لوگوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ گولہ باری کا تماشا دیکھنے کے لیے چھت پر چڑھ جاتے تھے۔

۱۶ ستمبر کو بہادر شاہ لال قلعے سے نکل کر انگریزوں سے لڑنے کی نیّت سے آگے بڑھے۔ قلعے سے کچھ فاصلے پر دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ بہت سے خیر خواہوں نے بہادر شاہ کو گھیر لیا اور سمجھا بجھا کر واپس لے گئے۔

دوسرے دن کشن گنج خالی کرالیا گیا۔ ۱۸ ستمبر کی شام تک شہر کی فوج کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ شہر کی آبادی اجمیری دروازے، ترکمان دروازے اور دہلی دروازے سے شہر چھوڑ کر باہر نکلنے لگی۔

جب شہر کے بڑے حصے پر انگریزی افواج کا قبضہ ہوگیا تو ۱۹ ستمبر کو بہادر شاہ نے بھی لال قلعہ چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ مگر بخت خان اس رائے سے متفق نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بہادر شاہ کسی جگہ پناہ لینے کے بجائے اُس کے ساتھ دہلی سے نکل کر وسیع و عریض ہندوستان میں گھوم کر اپنی جدو جہد کو جاری رکھیں۔ سارے ہندوستان کے جذبۂ آزادی کا مرکز ہونے کی وجہ سے وہ جہاں جہاں جائیں گے، لوگ دیوانہ وار اُس کا ساتھ دیں گے۔ اُن کے لیے نہ لشکر کی کمی ہوگی نہ خزانے کی۔ اس طرح وہ دونوں مل کر انگریزوں سے فیصلہ کن لڑائیاں لڑ سکیں گے۔ اگر خود بادشاہ نے ہتھیار ڈال دیئے یا وہ انگریزوں کے قبضے میں چلے گئے تو اُن کے ساتھ یہ تحریک بھی ختم ہو جائے گی۔ بہادر شاہ پر بخت خاں کی التجا کا بہت اثر ہوا۔ اُس وقت تو وہ ہمایوں کے مقبرے چلے گئے، مگر جاتے ہوئے بخت خاں سے دوسرے دن اس سلسلے میں گفتگو کرنے کا وعدہ کیا۔

۲۰ ستمبر کو انگریزوں نے لاہوری دروازے پر قبضہ کر لیا۔ اُن کی فوجیں شام تک چاندنی چوک سے ہوتی ہوئی، شاہی مسجد پہنچ گئیں۔ شہریوں نے مسجد کی سیڑھیوں پر بھی دو بدو مقابلہ کیا۔ یہ معرکہ اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اُن کے پاس صرف ڈنڈے یا تلواریں تھیں۔ دوسری طرف انگریز فوج جدید

ہتھیاروں سے مسلح تھی ۔ اس پر بھی اُسے پسپا ہونا پڑا ۔ دراصل عوام نے جب انگریزوں کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا تو اُن کے جذبات اس حد تک بھڑک اُٹھے کہ جس کے ہاتھ جو چیز لگی وہ اُٹھا کر اور انجام سے بے خبر ہو کر وہ انگریزی دستے سے لڑنے لگا ۔ اس دستے کا افسرِ اعلیٰ مٹکاف تھا ۔ اُس کے حکم پر ایک جگہ ٹھہر کر فائرنگ کی گئی تو دو سو مسلمان وہیں ڈھیر ہو گئے ۔ مگر یہ المیہ بھی ان کے جوش کو ٹھنڈا نہ کر سکا ۔ غیر قوم کے ہاتھوں مسجد کی بے حرمتی کے تصور نے اُن میں ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی تھی ۔ آناً فاناً وہ انگریزوں کے سر پر پہنچ گئے ۔ دُو بدُو تلوار کی لڑائی میں بہت سے انگریز مارے گئے ۔ جو باقی بچے ، وہ ان نہتوں کا ولولہ دیکھ کر بھاگ نکلے ۔ مجاہدین نے کشمیری دروازے تک اُن کا پیچھا کیا ۔

اپنوں کی غدّاری

لاغر جسم، لمبا چہرہ، بڑی بڑی اور روشن آنکھیں، پتلی ستواں ناک، تیکھے خدو خال، پیشانی پر جھریوں کی شکل میں فراست اور تدبر نمایاں، مجموعی طور پر وجاہت اور عالی حوصلگی کی نشان دہی کرنے والا چہرہ — یہ تھے بہادر شاہ، جو ۱۹ ستمبر کو بے سروسامانی اور کس مپرسی کے عالم میں ہمایوں کے مقبرے پر پہنچے۔ جیسے کوئی ستم رسیدہ معصوم بچّہ مخالف گروہ سے جان بچا کر باپ کے مضبوط بازوؤں میں پناہ لینے کے لیے دوڑتا ہے۔

اہلِ خرد کے نزدیک یہ بات کتنی ہی مضحکہ خیز اور احمقانہ کیوں نہ ہو، مگر تاریخ بتاتی ہے کہ ہمایوں کے مقبرے میں مغل خاندان اور عام مسلمانوں کے لیے آغوشِ مادر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ محض اتّفاق ہو یا اُس عظیم بادشاہ کے مزاج کی نرمی، رحم دلی، رواداری اور عالی حوصلگی کا اثر عمارت کے در و دیوار پر بھی پڑا ہو۔ اس خوبصورت عمارت نے صرف آخری مغل بادشاہ اور اُس کے لواحقین ہی کو پناہ نہیں دی بلکہ آگے چل کر جب بھی دہلی کے مسلمانوں پر کوئی مصیبت پڑی تو اس مقبرے نے ان بے سروسامان اور پریشان حال لوگوں کو

اپنے سائے میں جگہ دی۔

بہادر شاہ کے مقبرے میں قدم رکھتے ہی انگریزوں کا محکمۂ جاسوسی حرکت میں آگیا۔ جنگی معاملات تقریباً ختم ہو چکے تھے اب سیاسی نوعیت کی کارروائیوں کا آغاز ہُوا۔ غدّاروں اور ایجنٹوں کی ٹولی کے سربراہ منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش تھے۔ اُنھوں نے بادشاہ کو گرفتار کرکے انگریزوں کی نظر میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ مرزا الٰہی بخش نے بہادر شاہ کو سمجھایا کہ بخت خان کا ساتھ دینے سے شاہی خاندان برباد ہو جائے گا۔ بادشاہ، زینت محل اور خاندان کی دوسری پردہ نشین خواتین کو در در کی خاک چھاننا پڑے گی۔ انگریزوں پر فتح حاصل کرنے کی صورت میں بادشاہ کو بخت خان کے اشارے پر چلنا پڑے گا۔ اور اگر اتنی صحرانوردی کے بعد بھی تحریکِ آزادی کو شکست کھانا پڑی تو انگریز شاہی خاندان کو ہرگز معاف نہ کریں گے۔ کیونکہ اس طرح اُنھیں بہادر شاہ کی انگریز دشمنی کا یقین ہو چکا ہو گا۔ اس کے برعکس اگر بہادر شاہ بخت خان کا ساتھ چھوڑ دیں تو اُن کے لیے انگریزوں کو یہ باور کرانا مشکل نہ ہو گا کہ بادشاہ دل سے تحریک کے ساتھ نہ تھے۔ مرزا نے یہ وعدہ بھی کیا کہ اگر بادشاہ اُس کے کہنے پر چلے تو وہ خود درمیان میں پڑ کر شاہی خاندان کی جان، مرتبہ، وظیفہ اور جواں بخت کی ولی عہدی کی ضمانت دلا دے گا۔

مرزا الٰہی بخش کی باتوں کا اثر بہادر شاہ سے زیادہ زینت محل پر ہُوا۔ وہ مرزا الٰہی بخش کو بہت خیر خواہ، دانا اور زیرک سمجھتی تھیں۔ جب زینت محل کو یقین ہو گیا کہ مرزا الٰہی بخش بادشاہ کا وظیفہ اور اُس کے بیٹے کی ولی عہدی بحال کرا دے گا تو وہ بھی بہادر شاہ کو راضی کرنے کی کوشش میں مرزا کے ساتھ ہو گئیں۔

حالات بد سے بدتر ہو چکے تھے۔ مگر اب بھی تختِ دہلی کے وقار اور دبدبے کا یہ عالم تھا کہ دہلی کی تسخیر کے بعد بھی انگریز فوج میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اُس نحیف و نزار، بے سروسامان اور خانماں برباد بادشاہ کو گرفتار کر سکتی جو قبرستان میں چھپا بیٹھا تھا۔ دوسری طرف ملک اور قوم کی بدقسمتی کا یہ حال تھا کہ خود بادشاہ کی بیوی اور اُس کے ساتھی کوشاں تھے کہ وہ خوشی سے گرفتار ہو جائے۔ آخر زینت محل کی چرب زبانی اور مرزا الٰہی بخش کی عیّاری نے میدان مار لیا اور وہ کھوکھلی عمارت جو دیکھنے میں بڑی عظیم الشان تھی، ایک اشارے میں سرنگوں ہو گئی۔

دوسرے دن حسبِ وعدہ بخت خان بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہی باتیں دہرائیں جو ایک دن پہلے کہہ چکا تھا۔ مرزا الٰہی بخش بھی وہاں موجود تھا۔ وہ بخت خاں کی ہر بات کاٹتا جاتا اور کسی طرح بادشاہ کو راہِ راست پر نہ آنے دیتا تھا۔ ایک دفعہ یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ بخت نے اُسے مار ڈالنے کی نیّت سے تلوار کھینچ لی۔ مگر اُس کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور بالآخر بادشاہ نے اُس سے معذوری ظاہر کر دی۔ بخت خاں نا اُمید اور دل شکستہ ہو کر واپس چلا گیا۔

جو واقعہ تاریخ کے صفحات پر جگہ پا لیتا ہے وہی مستند سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ بخت خاں کی بات مان لینے کی صورت میں بہادر شاہ کا کیا حشر ہوتا۔ آیا وہ وسیع و عریض ہندوستان کی خاک چھاننے کے بعد اتنے وسائل اور فوج اکٹھی کر لیتے کہ انگریزوں سے اپنا کھویا ہوا تخت واپس لے سکتے یا وہ اسی جدّوجہد اور صحرا نوردی کی حالت میں انگریزوں سے لڑتے ہوئے مر کھپ جاتے۔ بہر حال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر بہادر شاہ آزادی کے لیے لڑتے ہوئے

مارے جاتے تو اُن کا نام ہمیشہ ایک جانباز کی حیثیت سے زندہ رہتا۔ وہ صحیح طور پر بابر، اکبر اور اورنگ زیب کے جانشین کہلاتے۔ تاریخ میں جہاں بابر کا نام مغل سلطنت کے بانی کی حیثیت سے لیا جاتا، وہاں بہادر شاہ کو ایسا مجاہد بادشاہ لکھا جاتا جس نے اپنے باپ دادا کا تخت بچانے کی کوشش میں جان دے دی۔ اُن کی اس فاتحانہ موت کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا تھا کہ ان کے بعد کوئی اور بہادر شاہ آزادی کا عصا اُٹھا کر آگے بڑھتا اور اس سرزمین کو مزید سو سال تک انگریزوں کے قدموں کے نیچے نہ روندنے دیتا۔ مگر اُس بدنصیب کی قسمت میں جہاں شاہانہ جاہ و جلال نہ تھا وہاں سپاہیانہ موت بھی نہ تھی۔

بخت خان نا اُمید ہو کر چلا گیا تو غدّاروں کی جان میں جان آئی۔ میرزا الٰہی بخش نے اپنی کامیابی کی اطلاع فوراً رجب علی کو بھجوائی۔ وہ دوڑا دوڑا میجر ہڈسن کے پاس گیا اور اُسے اس کارنامے کی اطلاع دی۔ میجر ہڈسن نے جنرل ولسن سے بادشاہ کی جان بخشی اور گرفتاری کا پروانہ حاصل کیا، پھر سواروں کا ایک دستہ اور رجب علی کو ساتھ لے کر مقبرے پہنچا۔

انگریز قوم بڑے کاموں کو ڈرامائی طور پر انجام دینے کی عادی ہے۔ چنانچہ تاریخ ہند کے سب سے الم ناک واقعہ کو بھی بڑے ڈرامائی انداز میں انجام دیا گیا میجر ہڈسن سواروں کے ساتھ مقبرے کے باہر ٹھہرا اور رجب علی بادشاہ کے حضور میں اس طرح پیش ہوا جیسے وہ لال قلعے کے دیوان خاص میں بیٹھا ہو۔ اُس نے نذر پیش کر کے میجر کی باریابی کے لیے اجازت طلب کی۔ اُس وقت تک بہادر شاہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے تھے۔ رجب کے پہنچنے کے بعد ایک بار پھر وہی بحث چھڑی جو

دو گھنٹے تک جاری رہی۔ بہادر شاہ خوشی سے خود کو انگریزوں کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے۔ مگر غدّار انگریز کو خوش کرنے کی خاطر قومی وقار کے اس آخری چراغ کو بجھانے پہ تلے تھے۔ آخر سازش نے حق کو مغلوب کر لیا اور بادشاہ کی طرف سے میجر کو پیغام بھیج دیا گیا کہ جان بخشی کی صورت میں وہ خود کو حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میجر ہڈسن نے خوشی خوشی اُن کی ہر بات منظور کر لی ___ اور تھوڑی دیر بعد شاہی خاندان جلوس کی شکل میں ایک بار پھر لال قلعے کی طرف چل پڑا۔

بہادر شاہ کتنی ہی بار چاندنی چوک سے ہوتے ہوئے لال قلعے میں داخل ہوئے ہوں گے، مگر انھیں کیا معلوم تھا کہ ایک دن یہی لال قلعہ اُن کے لیے ایک مضبوط و مستحکم جیل خانے کا کام دے گا۔ قیدیوں کا یہ قافلہ اس شکل میں شہر سے گزرا کہ آگے آگے زینت محل کی پالکی تھی، اُس کے پیچھے شہزادہ جواں بخت کی سواری اور سب کے پیچھے بہادر شاہ ہوادار پر سوار تھے۔ قیدیوں کی کل تعداد چھیانوے تھی جن میں عورتیں، مرد، بچّے سب ہی شامل تھے۔ ان سب سے ہتھیار پہلے ہی رکھوا لیے گئے تھے۔

لال قلعے میں پہنچ کر بادشاہ کو زینت محل کے مکان میں رکھا گیا اور اُس پر انگریزی دستے کا پہرا لگا دیا گیا۔

شاہی خاندان کا انجام

بادشاہ کی گرفتاری کو بھی غدّاروں نے کافی نہ سمجھا۔ اِدھر سے مطمئن ہو کر وہ تازہ شکار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ مرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی میجر ہڈسن کو ساتھ لے کر دوبارہ مقبرہ ہمایوں پہنچ گئے اور بادشاہ کے بیٹوں کو تلاش کرنے لگے۔ ان کی مدد کے لیے سو انگریز فوجی بھی ساتھ تھے مگر میجر ہڈسن میں اتنی ہمت نہ تھی کہ مفرور شہزادوں کو براہِ راست گرفتار کر لیتا۔

انگریزوں نے مقبرے کو چاروں طرف سے گھیر کر راہِ فرار بند کر دی۔ پھر رجب علی شہزادوں کو گرفتاری پر آمادہ کرنے کے لیے اُن کے پاس گیا۔ وہاں دو شہزادے میرزا مغل اور میرزا خضر سلطان تھے۔ بہادر شاہ کا پوتا میرزا ابوبکر بھی ان کے ساتھ تھا۔ خیر خواہوں اور جان نثاروں کا ایک ہجوم شہزادوں کو گھیرے ہوئے تھا۔ شہزادے بزدلوں کی طرح ہتھیار ڈالنے اور گرفتار ہو جانے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور بہی خواہوں کا بھی اصرار تھا کہ اس طرح گرفتار ہونے کے بجائے لڑتے لڑتے جان دی جائے۔ وہ سب انگریزوں اور ان کے ایجنٹ رجب علی سے کسی طرح کا سمجھوتا کرنے پر موت کو ترجیح دیتے تھے۔ دیر تک بحث

ہوتی رہی۔ رجب علی کی مدد کے لیے مرزا الٰہی بخش بھی آ گیا۔ دونوں نے شہزادوں کو سمجھایا کہ ان سرپھرے لوگوں کے کہنے میں آکر اپنی جانوں کو خطرے میں نہ ڈالیں۔ اگر انھوں نے خود کو خوشی سے گرفتاری کے لیے پیش کر دیا تو انگریز ان کی جان نہیں لیں گے۔ آخر بہادر شاہ کی طرح شہزادے بھی غداروں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئے اور انھوں نے خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

انگریزوں نے فوراً تمام بہی خواہوں سے ہتھیار رکھوا لیے۔ تھوڑی دیر بعد حرماں نصیبوں کا یہ دوسرا قافلہ لاہوری دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ آگے آگے بیل گاڑی میں شہزادوں کو بٹھا دیا گیا تھا۔ اُن کے پیچھے سو گورے گھوڑوں پر سوار آ رہے تھے۔ سب کے پیچھے بدنصیب شہریوں کا ہجوم تھا، جو اپنے شہزادوں کو اس حال میں دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو چکے تھے اور نتائج سے بے پروا ہو کر اُن کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ان کے چہروں سے نفرت، غیظ و غضب اور حزن و ملال کی ملی جلی کیفیتوں کا اظہار ہوتا تھا۔

نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ منحوس گھڑی آ پہنچی جس نے ایک طرف مظلوم شہریوں کے صبر کا امتحان لیا اور دوسری طرف، انگریزوں کے کردار کا۔ میجر ہڈسن شاہی خاندان کے خون کا پیاسا تھا۔ اُس کے دل میں انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی اُسے بجھانے کے لیے بہادر شاہ کا خون نہ مل سکا تو اُس نے شہزادوں کا خون بہانے کی ٹھان لی۔ اُس نے آدھا سفر صرف اس اُمّید میں طے کیا تھا کہ شاید مجمع اپنے شہزادوں کو اس حالت میں دیکھ کر قابو سے باہر ہو جائے اور شورش کر بیٹھے۔ ایسی صورت میں اُسے ہزاروں افراد کو قتل کرنے کا نادر موقع مل جاتا

اور اس قتلِ عام کے لیے وہ اپنے افسروں اور ہم قوموں کے سامنے بھی جواب دہ نہ ہوتا۔ جب مجمع نے غیر معمولی نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے آدھا راستہ خاموشی سے طے کر لیا تو میجر ہڈسن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ وہ گھوڑا دوڑا کر آگے پہنچا اور شہزادوں کو بیل گاڑی سے نیچے اُتار کر گولی مار دی۔ ہجوم نے یہ منظر دیکھا تو یک زبان ہو کر اللہ اکبر کہا اور دہشت زدہ لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ اس واقعہ کو خود انگریز مؤرخوں نے ۱۸۵۷ء کا المناک واقعہ قرار دیتے ہوئے میجر ہڈسن کے لیے جلّاد اور وحشی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

شہزادوں کی لاشیں تین دن تک کوتوالی کے دروازے پر پڑی سڑتی رہیں، پھر اُنھیں دفن کر دیا۔

ان شہزادوں کے بعد شاہی خاندان کے دوسرے افراد کی باری آئی۔ اس وقت انگریزوں پر محض انتقام ہی کا بھوت سوار نہ تھا بلکہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ بادشاہ کا کوئی قریب یا دُور کا رشتہ دار زندہ نہ بچے۔ اُن کے خیال میں اس خاندان کا ایک فرد بھی زندہ بچ کر کبھی نہ کبھی بادشاہی کا دعوے دار بن سکتا تھا۔ اسی لیے انھوں نے باقاعدہ مقدمہ چلا کر انصاف اور قانون کی روشنی میں فیصلے کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ شاہی خاندان کے ہر فرد کو خواہ وہ قلعے میں رہتا ہو اور تحریکِ آزادی میں شریک نہ رہا ہو، گرفتار کرنا اور پھانسی دینا ضروری سمجھا۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو بیمار، معذور اور مجبور تھے۔ جنھوں نے کبھی بغاوت کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا اور نہ کسی طرح کی تحریک سے منسلک رہے تھے۔

اس گروہ کا روائی میں مرزا الٰہی بخش اور رجب علی کے ساتھ ساتھ ایک

اور شخص بھی شامل تھا، جسے اُس صدی کے بدترین انسانوں میں سے ایک قرار دینا بے انصافی نہ ہوگا۔ یہ مرزا کالے تھا جو خود بھی شاہی خاندان کا ایک فرد تھا۔ اُس نے اپنے ہی خاندان کے بے شمار آدمیوں کو پکڑوادیا۔ وہ انھیں ورغلا کر آمادہ کر لیتا کہ وہ خود کو بادشاہ کا رشتہ دار بتا کر انگریزوں سے وظیفہ اور سرکاری مراعات حاصل کریں ۔ اس طرح بہت سے معصوم شہزادے اُس کی عیاری کا شکار ہو کر پھانسی پر چڑھ گئے۔ ان میں شہزادہ میرزا قیصر جیسے کمزور اور عمر رسیدہ آدمی بھی تھے ۔تاہم جو لوگ گولی کھا کر یا پھانسی پا کر مر گئے وہی خوش نصیب تھے۔کیونکہ وہ اس ذِلّت ، رسوائی اور صعوبت سے بچ گئے جو شاہی خاندان کے بچے کھچے افراد کی قسمت میں لکھی تھی ۔ انھیں سزائے قید دی گئی اور جیل خانے کے تیسرے درجے کے مجرموں کے ساتھ رکھا گیا۔ اُن سے مشقّت لی جاتی اور سزا کے طور پر کوڑے بھی لگائے جاتے تھے۔

کچھ لوگ دہلی سے بھاگ کر دُوسرے شہروں میں چُھپ گئے تھے ۔ انھیں بھی معاف نہیں کیا گیا۔ مخبروں کے اطّلاع دینے پر اُنھیں پکڑ پکڑ کر بُلایا جاتا اور سزا دی جاتی ۔ ایسے لوگوں میں زینت محل کے والد نوّاب احمد قلی خاں بھی تھے۔ اُن کا انتقال قید خانے ہی میں ہُوا ۔

دہلی کی بربادی

دہلی متعدد بار فاتحوں اور غاصبوں کے ظلم وستم کا شکار ہو چکی ہے۔ اس شہر کی تاریخ فتح مند فوجیوں کی لوٹ کھسوٹ اور پُر امن شہریوں کے قتلِ عام کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ مگر ۱۸۵۷ء میں اُس پر جو قیامت گزر گئی اُس کا اندازہ غیر جانب دار انگریزوں کی تحریر سے کرنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جان لارنس نے اپنے ایک ساتھی کو لکھا تھا کہ:

"انگریزوں نے دوست اور دشمن کی تمیز کیے بغیر تمام شہریوں کو جی بھر کر لوٹا ہے۔ اُن کی اس حرکت پر اگر انگریز قوم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے تو بجا ہے۔ جو افسر شہر سے باہر جا کر بے گناہ شہریوں کو قتل کر دیتے ہیں، وہ سخت غلطی پر ہیں کیونکہ اس طرح وہ ہندوستان کی تمام آبادی کو انگریزوں کے خلاف ایک بار پھر جنگ کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔"

جب انگریزی فوجیں شہر میں داخل ہوتی تھیں تو اُن سے مقابلہ کرنے

والے تنگ و تاریک گلیوں کو چھوڑ کر دہلی دروازے سے اجمیری دروازے تک جم گئے تھے۔ وہیں ٹھہر کر اُنھوں نے زبردست مزاحمت کی تھی۔ مگر جوں جوں انگریزوں کا دہلی پر قبضہ ہوتا گیا، پُرامن شہری اپنے گھر بار چھوڑ کر شہر سے باہر کی طرف بھاگنے لگے تھے۔ اِردگرد کے موقع پرست لوگ جن کی نظروں میں دہلی کا عروج اور اس کی دولت عرصے سے کھٹک رہی تھی، شہر کے باہر ان پریشان حال شہریوں کا انتظار کر رہے تھے۔ مصیبت زدوں کے قافلے قطب مینار کی طرف روانہ ہوئے تو ان لٹیروں نے اُنھیں لوٹنا شروع کر دیا۔ شہر میں انگریز قتلِ عام میں مصروف تھے۔ ہندو، مسلمان، عورت، مرد، بچّہ یا بوڑھا جو بھی نظر آتا اُسے گولی مار دیتے۔ ایسی حالت میں ان بدنصیبوں کے لیے شہر کی طرف واپس آنا بھی مشکل تھا۔ لہٰذا سراسیمگی کے عالم میں جو کچھ گھروں سے لا سکے تھے، وہ ان لٹیروں سے چھنوا کر جان بچائی اور جس کے جہاں سینگ سمائے وہاں چھپ گیا۔ دہلی کے باہر دُور تک پھیلی ہوئی پُرانی عمارتیں اور کھنڈر ان کی پناہ گاہ بنے۔ اس نفسا نفسی میں شریف اور پردہ نشین خواتین نے بڑی صعوبتیں اُٹھائیں۔ اپنی عزّت بچانے کی خاطر وہ بھاگ بھاگ کر جنگلوں میں چھپ گئیں۔ بے شمار عورتیں اس صحرا نوردی کے عالم میں مرگئیں۔ ایسی عزّت دار اور غیور خواتین کا شمار کرنا مشکل ہے جنھوں نے اپنی عزّت بچانے کی خاطر کنوؤں میں چھلانگ لگادی۔ تاہم اُن کی تعداد کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ جب کنویں بھر جاتے تھے اور عورتوں کے لیے اُن میں جگہ نہ رہتی تو اُوپر کی خواتین زندہ بچ جاتی تھیں۔

شہر کے باہر تو یہ حال تھا اور اندر ہر طرف موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ سڑکوں پر لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں اور اُنھیں گدھ اور کُتّے نوچ رہے تھے۔ جب کوئی انگریز افسر یا فوجی اُدھر سے گزرتا تو لاشوں کو بھنبھوڑتے ہوئے گدھ آہٹ سُن کر وہاں سے ہٹنا چاہتے مگر اُن کے پیٹ اتنے بھرے ہوتے کہ اُن سے اُڑا بھی نہ جاتا تھا۔ اس ہیبت ناک منظر کو دیکھ کر گھوڑے بھی بدکتے تھے۔ یہ حال ایک دو شاہراہوں کا نہ تھا، بلکہ سارے شہر کی یہی کیفیت تھی۔

فاتحوں کو اس پر بھی چین نہ آیا تو اُنھوں نے شہر کی بچی کھُچی آبادی کو صاف کرنے کی ٹھانی۔ اس مقصد کے لیے ایک کوٹھی میں ہیڈ کوارٹر قائم ہوا۔ وہاں سے شہر میں فوجیوں کے دستے بھیجے جاتے۔ اُن کی ڈیوٹی یہ تھی کہ گلی کوچوں اور محلّوں میں گشت کریں اور جہاں کوئی مرد، عورت، بچّہ یا بوڑھا ملے اُسے پکڑ کر کوٹھی میں لے آئیں۔

حکومت کی طرف سے تین دن تک عام لُوٹ مار کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس کے لیے عُذر یہ پیش کیا گیا کہ فوج بے قابو ہو رہی تھی۔ اگر اجازت نہ ملتی تب بھی وہ شہر کو ضرور لُوٹتی۔ اُس زمانے میں دہلی کی شہرت بغداد کی طرح دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سکھوں اور ہندوستان کے دُوسرے موقع پرست لوگوں نے انگریزوں کا ساتھ ہی اس لیے دیا تھا کہ کامیابی کی صورت میں انھیں دہلی کو لُوٹنے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ اجازت ملتے ہی یہ "سُورما" فوجی بھوکے بھیڑیوں کی طرح سارے شہر میں پھیل گئے۔ جو مال

آسانی سے لوٹا جا سکتا تھا، سب سے پہلے اُس پر ہاتھ صاف کیا گیا۔ اُس کے بعد پوشیدہ دولت کی باری آئی۔ ان لوگوں کے طور طریق سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس فن میں مہارت رکھتے تھے۔ ایسے مکانوں میں پہنچتے ہی دیواروں اور فرش کو تھپتھپاتے، ان پر پانی ڈال کر سونگھتے اور پوشیدہ خزانے کا پتا چلا لیتے تھے۔

چند ہی روز میں شہر کی یہ حالت ہو گئی کہ گلیوں اور کوچوں میں جا بجا ایسا سامان پڑا ملتا تھا جو کسی کام نہ آسکتا تھا۔ کیونکہ لُوٹنے والے جو چیز اپنے ساتھ نہ لے جا سکتے اُسے توڑ پھوڑ ڈالتے تاکہ کسی اور کے کام نہ آسکے۔ اس قسم کے سامان کے علاوہ ہر جگہ کُتّے، بلّیاں اور گدھ نظر آتے تھے۔ اس لُوٹ مار میں معمولی سپاہیوں اور گوروں کے علاوہ بڑے بڑے افسر بھی شریک تھے۔ خود میجر ہڈسن نے لُوٹ کے مال کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔

اس ہنگامۂ دار و گیر کا ایک دل خوش کن پہلو یہ تھا کہ جو لوگ انگریزوں کے وفادار تھے اور ہر موقع پر اُن کی خیر خواہی کا ثبوت دیتے رہے تھے، اُنھیں اپنے ملک و قوم سے غدّاری کی سزا اس طرح ملی کہ قتلِ عام اور لُوٹ مار کے وقت اُن کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا۔ جب سارے شہر سے بدلہ لیا گیا تو وہ بھی محفوظ نہ رہ سکے۔

جو لوگ بھاگنا پسند نہ کرتے تھے یا کسی وجہ سے گھر چھوڑ کر کہیں نہ جا سکتے تھے، اُنھیں چُن چُن کر قتل کر دیا۔ سکھ فوجیوں اور گوروں کو مسلمانوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ گھروں میں گھس گھس کر مسلمان مردوں کو قتل کر دیتے

تھے۔ اگر کوئی راہ گیر ملتا تو سب سے پہلے اُس سے اُس کا مذہب معلوم کرتے۔ اگر وہ مسلمان نکلتا تو اُسے وہیں گولی مار دی جاتی۔ اس بربریت کے نتیجے میں چند ہی روز کے بعد دہلی مقامی آبادی سے خالی ہوگئی۔ ولیم مور کی تحریر کے مطابق اُس وقت کی حالت یہ تھی کہ شہری آبادی کو مرنے کے لیے باہر نکال دیا گیا تھا اور شہر میں لُوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ افسروں نے اتنی دولت کمالی تھی جو باقی زندگی رئیسانہ ٹھاٹ سے گزارنے کے لیے کافی تھی۔

تین دن تک افسروں کے حکم کی تعمیل میں شہر کو لُوٹا جاتا رہا۔ اس کے بعد ایسے دوسرے ذرائع اختیار کیے گئے کہ لُوٹ کا سلسلہ ذرا انوکھے انداز میں مہینوں تک جاری رہ سکے۔ اس کام کے لیے ایک ایجنسی بنائی گئی جس کا نام پرائز ایجنسی تھا۔ اس کے کئی شعبے تھے۔ کوئی شعبہ زمین کی کھدائی کر کے دولت نکالتا، کوئی صرف کتابیں جمع کرتا، اور کوئی گھریلو سامان مثلاً برتن، کپڑے، زیورات وغیرہ جمع کرتا۔ ہر شعبے کا مال خانہ الگ الگ عمارت میں ہوتا تھا۔ قیمتی سامان مثلاً زیورات، ہیرے جواہرات اور سونا چاندی لال قلعے میں ایک شامیانے کے نیچے جمع ہوتا تھا۔

اس ایجنسی نے لاکھوں روپے کی پوشیدہ دولت کھدائی کے ذریعہ برآمد کی۔ اس کے سربراہ کو لوگ "کھدنی صاحب" کہنے لگے تھے۔ اس محکمے کو غیر معمولی کامیابی اُس وقت ہوئی جب مخبروں کے لیے نقد انعام کا اعلان کیا گیا۔ جن معماروں اور مزدوروں کی مدد سے یہ دولت دفن کی گئی تھی، اُنھوں

نے مخبری کر کے سارا مال برآمد کرایا اور انعام پایا۔ بعض لوگوں نے خود اپنے ہی مال کی مخبری کی اور اس طرح وہ انعام پا لیا، جو کسی اور کو مل جاتا۔ آج کے زمانے میں اگرچہ یہ بڑی عبرت ناک بات معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنا ہی مال اپنے ہاتھ سے دوسروں کے حوالے کر دے مگر جہاں باپ کے سامنے اُس کے بیٹوں اور بھائی کے سامنے اُس کے بھائی کو گولی مار کر ہلاک کیا جا رہا تھا وہاں دولت کس گنتی میں تھی۔

لُوٹنے والوں کی بیدردی کا یہ حال تھا کہ وہ شہر میں کوئی ایسی چیز چھوڑنا نہ چاہتے تھے، جو کسی وقت مکینوں کے کام آ سکے۔ یا پھر اُن کی طمع اس بہتی گنگا کے ایک ایک قطرے کو اپنے دامن میں جذب کر لینا چاہتی تھی۔ چنانچہ حالت یہ تھی کہ جب اور کوئی چیز نہ ملتی تو بڑے بڑے دروازوں اور پھاٹکوں کو توڑ کر جلا دیا جاتا۔ اس میں سے جو پیتل یا لوہا نکلتا اُسے بیچ کر رقم بنا لی جاتی۔

دہلی کے کمشنر سانڈرس نے دہلی کی تسخیر کے ایک ماہ چار دن بعد ایک نوٹ میں لکھا تھا کہ:

"اگر اسی طرح فوج کو لُوٹ مار کے لیے آزادی حاصل رہی تو ایک دن وہ نظم و ضبط کو بھول کر لٹیروں اور غنڈوں کا گروہ بن جائے گی"

اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ لُوٹ مار کا یہ سلسلہ کم از کم نومبر تک ضرور جاری رہا۔

قتلِ عام

تحریکِ آزادی کے کچلے جانے کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی ـــــ آزادی کی جدّوجہد کے مجرموں کا انصاف کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا۔ بظاہر اس کا کام مقدمے کی چھان بین کر کے انصاف کرنا تھا، مگر درحقیقت وہ صرف سزائے موت سنانے کے لیے تھا۔ عدالتی کارروائی محض ایک ڈھونگ ہوتی تھی۔ جتنے مجرم پیش ہوتے وہ قصوروار ہوں یا نہ ہوں اُنھیں سزائے موت دے دی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک انگریز ورتھ سمتھ کی شہادت کافی ہوگی۔ اُس نے لکھا ہے کہ

" ایک دفعہ دس بارہ ملزم پیش ہوئے۔ اُن کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا مگر کمیشن کی نظر میں وہ سب مجرم قرار پائے، کیونکہ صورت شکل سے وہ سپاہی معلوم ہوتے تھے اور اُن پر زندگی میں کبھی نہ کبھی ہتھیار اُٹھانے کا شک کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اُن سب کو پھانسی دے دی گئی "۔

اس عرصے میں عام آبادی کے علاوہ جن لوگوں کو خاص طور پر چُن چُن کر پھانسی دی گئی وہ یہ تھے: قلعہ کے تمام ملازمین، میگزین کے وہ سپاہی جنھوں نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کیا، وہ تمام مجاہدین جو نہایت زخمی حالت میں مسجدوں وغیرہ میں چھُپ گئے تھے، وہ تمام فوجی جنھوں نے بھاگتے ہوئے مٹکاف پر حملہ کیا تھا، میواتی اور گوجر۔

صرف چاندنی چوک میں تین پھانسی گھر قائم تھے۔

پھانسی پانے والوں کو قطار میں کھڑا کر دیا جاتا۔ وہ اپنی باری کا انتظار کرتے رہتے۔ ان کے آگے کھڑے ہوئے لوگوں کو پھانسی ہو جاتی اور وہ

اپنی آنکھوں سے اُن کی لاشیں ہٹتی دیکھ لیتے تو اُن کی باری آتی تھی۔ یہ منظر انگریزوں کے لیے ایک دلچسپ تماشا تھا۔ وہ باقاعدگی سے وہاں جاکر بیٹھتے اور ہنستے بولتے ہوئے اس ڈرامے کو آخر تک دیکھتے رہتے تھے۔

معزز مسلمان شہریوں کے علاقے خاص طور پر انگریزوں کی نظر میں کھٹکتے تھے۔ بالکل بے گناہ لوگوں کو مختلف بہانے تراش کر ختم کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً کوچہ چیلان کے لوگوں نے اپنے قول یا فعل سے کسی انگریز کو گزند نہ پہنچایا تھا۔ اصولاً وہ علاقہ ہر طرح کی آفت سے محروم رہتا مگر ایک چھوٹے سے واقعہ کو بہانہ بنا کر بے شمار مردوں کو اُن کے گھروں میں گھس گھس کر قتل کر دیا گیا۔ جو باقی بچے، اُنھیں جمنا کے کنارے لے جاکر شوٹ کر دیا گیا۔

یہ سلسلہ دو چار روز تک نہیں بلکہ پورے پانچ ماہ تک جاری رہا۔ فروری کے آخر میں جان لارنس دہلی آیا تو اُس نے کوشش کر کے ایسا نظام قائم کیا کہ ملزموں کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقع مل جائے۔ مگر جوں ہی وہ دہلی سے گیا، پھر وہی کیفیت شروع ہو گئی۔

جو لوگ پھانسی پا کر یا کسی اور طرح قتل ہوئے، ان کی صحیح تعداد کا اندازہ مشکل ہے۔ تاہم محتاط مؤرخوں نے صرف پھانسی پانے والوں کی تعداد ستائیس ہزار بتائی ہے۔ ان سے کئی گنا زیادہ وہ لوگ تھے جو قتلِ عام میں مارے گئے۔ جلاوطنی، صحرانوردی اور فاقوں سے مرنے والوں کی تعداد کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

پھر دہلی کے اِردگرد کی ریاستیں بھی اس آگ کی لپیٹ سے نہ

بچ سکیں۔ والی جھجر نوّاب عبدالرحمان خاں کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔ اُس جواں مرد نے بڑے استقلال کے ساتھ موت کو خوش آمدید کہا۔ حالانکہ پھانسی پانے کے وقت اُس کی والدہ بھی وہیں موجود تھیں۔

بلب گڑھ کی حدود میں ایک انگریز کا قتل ہو گیا تھا۔ وہاں کے راجا نارسنگھ کو اسی جرم میں، رجنوری کو پھانسی دے دی گئی۔ وہ بڑا وجیہہ وشکیل اور حلیم الطبع جوان تھا۔

فرخ نگر کے رئیس احمد علی خاں کو بھی پھانسی دی گئی۔ رئیسوں کو بڑے کرّوفر سے پھانسی دی جاتی تھی۔ فوجی دستہ بینڈ بجاتا ہوا آتا۔ ملزم کو مشکیں کس کر لایا جاتا اور جب تماشا دیکھنے والے انگریز مرد عورتیں جمع ہو جاتے تو اس خونیں ڈرامے کو آخری شکل دی جاتی تھی۔

ان کے علاوہ بہت سے معزّزینِ شہر بے گناہ ثابت ہونے کے باوجود قتل کر دیے گئے۔ امیر مرزا نماز کے بعد تسبیح پڑھتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حکیم عبدالحق، نظام الدین خاں، عبدالصمد خاں اور حسن عسکری وغیرہ کو جھوٹی تہمتیں رکھ کر قتل کر دیا گیا۔ مرزا مغل بیگ نے مقدمے کی کارروائی کے دوران میں اپنی بے گناہی کے تمام ثبوت دے دیے تھے، مگر چونکہ وہ بادشاہ کا ملازم تھا اس لیے پھانسی دے دی گئی۔ کچھ لوگوں کی جان بچ گئی مگر جائدادیں ضبط ہوئیں، قید و بند کی صعوبتیں اُٹھائیں اور ذلّت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن میں نوّاب امین الدین احمد خاں، نواب ضیاء الدین احمد خاں، نوّاب مصطفٰے خاں شیفتہ، مفتی صدرالدین آزردہ اور نوّاب حامد علی خاں کے

نام سرِ فہرست ہیں۔

حاجی مہر کن بستی نظام الدین میں جا چھُپے تھے۔ وہیں سے پکڑے ہوئے آئے تو مٹکاف نے جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر تلوار کا وار کیا اور مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ وہ کئی ماہ تک زیرِ علاج رہے۔ پھر ترکِ وطن کر کے لاہور چلے گئے۔ کئی سال تک نام بدل کر وہیں رہتے رہے، مگر ۱۸۶۸ء میں گرفتار ہو کر آئے اور پھانسی پائی۔

مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر بھی بے باکی اور حق گوئی کے جُرم میں شہید کر دیے گئے۔ اُن کا جُرم یہی تھا کہ اُنھوں نے جھوٹ بولنا گوارا نہ کیا تھا۔

نوّاب محمد حسن خان نے ایک انگریز عورت اور ناصر الدین نے چند عیسائی عورتوں کی جان بچائی تھی، مگر ان دونوں کو بھی ختم کر دیا گیا۔

احمد مرزا اور اصغر یار خاں دہلی میں مسافر کی حیثیت سے تھے۔ وہ بے گناہ قتل ہوئے۔ بے گناہ پھانسی پانے والوں میں اُستاد ذوق کے صاحبزادے خلیفہ اسمٰعیل بھی تھے۔

مُسلم تہذیب کی تباہی

جن لوگوں نے بیسویں صدی کے انگریز، اُس کے قانون اور اُس کے حسنِ انتظام کو دیکھا ہے، وہ مُشکل ہی سے یقین کریں گے کہ جو قوم خود کو مہذّب کہلانے کے لیے اس قدر مُصر ہے، وہ انیسویں صدی میں کتنی بربریت کا مظاہرہ کر چکی ہے۔

اگر بعض انگریز مؤرخوں کے بیانات کی روشنی میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ۱۸۵۷ء کی افراتفری اور غدر چند "سرکش" سپاہیوں، "مخبوط الحواس" بوڑھے بادشاہ، "احمق" شہزادوں اور بھوڑے سے "سرپھرے" حریت پسندوں کی بغاوت تھی تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس جُرم کی سزا سارے ہندوستان کے عوام کو کیوں دی گئی۔ بالخصوص اسلامی تہذیب و ثقافت کو جوشِ انتقام کا نشانہ کیوں بنایا گیا؟

دہلی اور اودھ میں تسخیر کے بعد جو کچھ کیا گیا، اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سارے مُلک کے جُرم کی سزا صرف مسلم قوم کو دی گئی۔ نہ صرف مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا بلکہ اُن کی تہذیب، تمدّن، تاریخ اور ثقافت کو کالعدم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اُن کا سامان اور جائدادیں چھین کر اُنھیں اقتصادی طور پر اتنا تباہ کر دیا گیا کہ مدّتوں سر نہ اُٹھا سکیں۔

یہ خانماں برباد اپنی دہلی کو پھُولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح چھوڑ کر بھاگے تھے، مگر حالات ٹھیک ہونے کے بعد واپس آئے تو وہ ایک ایسے پودے کی طرح تھی جس پر ایک پتّا بھی نہ چھوڑا گیا تھا۔

۱۔ دہلی کی جامع مسجد سکھ فوجوں کی بیرک بن چکی تھی۔

۲۔ دوسری بڑی مسجد میں گورا پلٹن مقیم تھی۔

۳۔ اہلِ تشیع کی ایک مسجد میں جو نوّاب حامد علی خاں کی مسجد کہلاتی تھی، گدھے باندھے جاتے تھے۔

۴۔ ایک مسجد کو مہاراجا جیند نے گوردوارے میں شامل کر لیا تھا۔

۵۔ چوک سعداللہ، اُردو بازار، خانم بازار، خاص بازار اور فیض بازار ڈھائے جا چکے تھے۔

۶۔ چھوٹی چھوٹی بے شمار مسجدوں کے علاوہ اکبرآبادی مسجد اور اورنگ آبادی مسجد کو مسمار کر دیا گیا تھا۔

۷۔ پریشان حال، بدنصیب اور خائف عورتوں بچّوں کو نکال کر عالی شان عمارتیں اور محلّے منہدم کر دیے گئے تھے۔ مثلاً بلاقی بیگم کا کوچہ، خانِ دوراں کی حویلی، انگوری باغ، دریا گنج کی گھاٹی، بگوا باڑی، پنجابی کٹرا، سعادت خاں کا کٹرا، رام گنج، جرنیل کی بی بی کی حویلی وغیرہ۔

۸۔ جامع مسجد سے رام گھاٹ تک کی تمام عمارتیں مسمار کر دی گئی تھیں۔

۹۔ لال قلعہ اور جامع مسجد کے قریبی علاقے کا نقشہ بدل دیا گیا تھا۔ بلبشتر مکانات ہاتھیوں کے ذریعے منہدم کرا دیے گئے تھے۔ جو علاقہ اس زد سے بچ گیا، اُسے بارُود سے اُڑا دیا گیا تھا۔ اس کارروائی میں مشہور اسلامی مدرسہ دارالبقا بھی منہدم ہو گیا۔ پُورے علاقے کا ملبہ اور درخت نیلام کر دیے گئے۔ یہاں تک کہ بنیادوں کے پتّھر بھی فروخت کر دیے گئے تھے۔

۱۰۔ لال قلعہ کے اندر کی عالی شان عمارتیں، مثلاً امیروں اور شہزادوں کے محلّات، دیوانِ عام کا کچھ حصّہ، رنگ محل کے فوّارے، حوض، موتی محل، باغِ حیات بخش، مہتاب باغ، چھوٹی بیٹھک اور شاہی مطبخ سب توڑ پھوڑ کر بدنما بیرکیں بنا دی گئی تھیں تاکہ لال قلعے کی شان و شوکت جاتی رہے۔

یہ سب ایسی کارروائیاں تھیں، جن پر انگریز عمل کر سکے۔ ان کے علاوہ افسروں

نے کچھ ایسی تجویزیں بھی پیش کیں، جن پر اگرچہ کسی سبب سے عمل نہ ہو سکا مگر وہ اُس دَور کے انگریزوں کی ذہنیت اور آتشِ انتقام کی تپش کا دستاویزی ثبوت ہیں۔

بعض افسروں کا اصرار تھا کہ پُورا شہر مسمار کر کے زمین ہموار کر دی جائے۔

بعض کہتے تھے کہ لال قلعہ اور جامع مسجد کو بالکل منہدم کر دیا جائے۔

بعض اعتدال پسند انگریزوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ صرف جامع مسجد کو کلیسا میں تبدیل کر کے دہلی کا نام لارنس آباد رکھنے پر اکتفا کیا جائے۔

مُسلمانوں کی معاشی تباہی

آزادی کی تحریک میں ہندوستان کی تمام قومیں شریک تھیں۔ اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی، تو اُس کا فائدہ بھی سب کو یکساں پہنچتا۔ مگر ناکامی کی صورت میں جب نقصانات کی تقسیم ہوئی تو مسلمانوں کو سب سے زیادہ حصّہ ملا۔ انگریزوں سے پہلے مسلمان ہی ہندوستان کے حاکم تھے لہٰذا کامیابی کے بعد فاتحوں نے صرف انھیں سرکشی اور بغاوت کا ذمّہ دار ٹھہرایا۔ انھی کا قتلِ عام ہُوا، انھی کے گھر لٹے، انھی کی جاگیریں ضبط ہوئیں اور انھی کو اقتصادی طور پر تباہ کیا گیا۔

انگریزی دَور میں مسلمانوں نے پرامیسری نوٹ خرید رکھے تھے۔ جب انگریزی حکومت کا چراغ گل ہونے لگا تو اُنھوں نے گھبرا کر تمام پرامیسری نوٹ آدھی سے بھی کم قیمت پر ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ ہندو نقد سرمایہ گھر میں رکھتے گھبراتے تھے اس لیے وہ اس کاغذی دولت ہی سے مطمئن ہو گئے۔ اب اُسے ان کی کاروباری سُوجھ بوجھ کہا جائے یا خوش نصیبی کہ انگریز واپس

آ گئے اور اہلِ ہنود کو دو گنا منافع ہُوا ۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے پرامیسری نوٹ بیچ کر جو رقم حاصل کی تھی، وہ لٹیروں کی نذر ہو گئی ۔

مسلمانوں سے پہلے ہندوؤں کو شہر میں رہنے کی اجازت ملی تھی لہٰذا اُنھوں نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پرائز ایجنسی کا مال کوڑیوں کے مول خریدنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ لُوٹ کا مال سپاہیوں وغیرہ سے خریدنے کے لیے جگہ جگہ دکانیں کھول لیں۔ لُوٹنے والوں کی ناواقفیت کی وجہ سے بڑا قیمتی سامان اُنھیں سستے داموں مل گیا۔ پھر کچھ عرصے بعد مسلمانوں کی ضبط شدہ جائدادیں اور مکانات نیلام ہوئے تو یہی لوگ اُس کے خریدار بنے۔ غرض انگریزوں کی جانبداری اور ہندوؤں کی تاجرانہ حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جہاں ایک طبقہ بالکل برباد ہو گیا وہاں دوسرے نے انگریزوں سے بچی ہوئی ساری دولت کھینچ لی ۔

انگریزوں نے ہندوؤں کو شہر میں رہنے کی اجازت کے عوض لاکھوں روپیہ بطور جُرمانہ وصُول کیا تھا۔ مگر ہندوؤں نے انھی سے لوٹ کا مال سستے داموں خرید کر اور اُن کی ضرورت کی چیزیں منہ مانگی قیمت پر فروخت کر کے جرمانے کی رقم سے کئی گُنا زیادہ وصُول کر لیا ۔

مسلمانوں کی درماندگی اور زبوں حالی کا یہ حال تھا کہ جان لارنس کے زمانے میں اُنھیں شہر میں آباد ہونے کی اجازت ملی ۔ نیز ازراہِ ہمدردی انھیں یہ رعایت بھی دی گئی کہ وہ ڈیڑھ روپے کے عوض دو چارپائیاں اور ایک چکّی خرید سکتے ہیں۔ گویا ان دو چیزوں سے دہلی کے مسلمانوں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا ۔

ظلم وستم کے بدترین واقعات

فاتح افواج کی طرف سے اگر باقی ہندوستان میں شقاوت اور بہیمیت کا مظاہرہ نہ کیا جاتا تو دہلی کی تباہی کو نظر انداز کرنا ممکن تھا۔ کیونکہ وہ ہندوستان کا دارالسلطنت ہونے کے علاوہ تحریکِ آزادی کا مرکز بھی تھی اور مرکز ہمیشہ دشمن کے انتقام کا نشانہ بنتا ہے۔ مگر ہوا یہ کہ لکھنؤ، بنارس، الہ آباد، کانپور، فرخ آباد، بدایوں، شاہ جہاں پور، مراد آباد، اٹاوہ، ایٹہ، آگرہ، علی گڑھ، مین پوری، بلند شہر، مظفر نگر اور سہارنپور، غرض جہاں جہاں انگریزوں نے اپنی کھوئی ہوئی حکومت حاصل کی، وہاں قتل و غارت گری کے ایسے طوفان آئے کہ کم از کم ہندوستان کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بے شمار بستیاں جلادی گئیں۔ سامان لوٹ کر بے گناہ شہریوں کو قتل کر دیا گیا۔ کسی گاؤں میں ایک بھی باغی مل گیا تو پورا گاؤں جلا دیا گیا اور انسانی سر نمائش کے لیے لٹکا دیے گئے۔ ان حالات میں اگر کسی شخص کو صرف جلا وطنی یا عمر قید کی سزا دی جاتی تو اُسے خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔

۱۔ نکلسن کے لیے یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ جہاں جنگل میں پھانسی گھر

دیکھے جاتے وہاں سمجھ لیا جاتا تھا کہ ادھر سے نکلسن کا گزر ہوا ہے ۔ اُس کے سامنے جو شخص بھی پکڑا ہوا آتا۔ وہ اُسے بلا پس و پیش سزائے موت دے دیتا۔ اُس کا حکم تھا کہ کوئی دیسی آدمی خواہ وہ کسی مرتبے کا ہو سپاہیوں کے سامنے سے بغیر سلام کیے سواری پر نہیں گزر سکتا۔ ایک خط میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے لکھا تھا کہ اگر اُس کے اختیار میں ہوتا تو جن لوگوں کے ہاتھوں انگریز عورتوں اور بچّوں کا قتل ہوا ہے، اُن کی کھالیں کھنچوائی جاتیں، جسم میں میخیں ٹھونکی جاتیں اور زندہ جلا دیا جاتا۔

۲۔ ٹامسن کی تحقیق کے مطابق بعض مقامات پر اس طرح کی سزائیں دی گئیں کہ مسلمانوں کو سور کے چمڑے میں سیا گیا اور اُن کے جسم پر سور کی چربی ملی گئی۔ کہیں کہیں ہندوؤں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

۳۔ چند لڑکوں کو صرف اس جرم میں پھانسی کی سزا دی گئی کہ وہ عَلمِ بغاوت بلند کر کے مصنوعی تاشے بجانے کا کھیل کھیل رہے تھے۔ فوجی عدالت نے ان پر مقدمہ چلاتے وقت اُن کی کم عمری اور ناسمجھی کا لحاظ نہ کیا۔

۴۔ صرف الٰہ آباد میں سات ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ کئی دن تک لاشیں چھکڑوں کے ذریعہ اُٹھائی جاتی رہیں۔ پھانسی کا رواج اتنا عام ہو گیا تھا کہ بہت سے بے روزگار لوگوں نے اسے باقاعدہ پیشے کی حیثیت سے اپنا لیا۔ اس بدترین کام کو انجام دینے کے لیے اُنھوں نے نئے نئے طریقے ایجاد کیے۔ وہ بستی بستی گھوم کر انگریزوں کو اپنے ایجاد کیے ہوئے نئے طریقوں سے آگاہ کرتے اور اپنی خدمات پیش کرتے تھے۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی

تھا کہ پھانسی کا پھندا درخت میں لٹکا دیا جاتا۔ مجرم کو ہاتھی پر بٹھا کر اُدھر سے جاتے اور اچانک پھندا اُس کے گلے میں ڈال کر ہاتھی کو دوڑا دیا جاتا۔ اس طرح کی موت بڑی اذیّت ناک ہوتی تھی۔

۵۔ مہنری کاٹن کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ کچھ قیدیوں کو اذیّت دینے کے لیے اُن کے جسم کو تانبے کے پیسوں سے بھی داغا گیا۔ جب اُن کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہوگئی تو اُنھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ایک قیدی کا چہرہ سنگینوں سے زخمی کر کے دھیمی آگ پر جلایا گیا۔ تھوڑی دیر میں اُس کا گوشت پھٹ کر سیاہ ہوگیا۔

۶۔ کرنل نیل نے کانپور کی طرف فوج بھیجتے ہوئے افسروں کو ہدایت کی تھی کہ پٹھانوں کے محلے کو منہدم کر کے وہاں کے رہنے والوں کو قتل کر دیا جائے۔ باقی تمام باغیوں کو پھانسی دے دی جائے، اور دیوان حکمت اللّٰہ کا سر کاٹ کر کسی بڑی اسلامی عمارت پر لٹکا دیا جائے۔

۷۔ فتح مند فوج فتح پور میں داخل ہوئی تو حسبِ دستور لوٹ مار کرنے کے بعد انگریز آگے بڑھ گئے اور سکھوں کو وہاں چھوڑ دیا تاکہ وہ باغیوں کو پھانسی دینے اور بستیوں کو جلانے کا کام انجام دیں۔ اُنھوں نے دیوان حکمت اللّٰہ کو پکڑ کر پھانسی دینے سے پہلے اُن کے مُنھ میں سور کا گوشت ٹھونسا۔

۸۔ کانپور میں انگریز قیدیوں کا قتلِ عام ہُوا تھا، لہٰذا وہ اس شہر سے بھیانک انتقام لینا چاہتے تھے۔ یہاں تقریباً دس ہزار افراد کو قتل کیا گیا۔ ہزاروں افراد بھاگتے ہوئے گرفتار ہوئے اور قتل کر دیے گئے۔ جب لُوٹ مار اور قتلِ عام

انتہا کو پہنچ گیا تو ہیولاک نے اس لاقانونیت کو حکماً بند کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ
نیل نے اُسے "برہمنیت سے متأثر انگریز" قرار دیا۔ اور باغیوں کو سزا دینے
کے سلسلے میں اور بھی سخت احکام جاری کیے۔ اُس نے فوجیوں کو ہدایت
کی کہ کسی مکان کی دیواروں یا فرش پر اگر دیسی آدمیوں کا خون لگا ہو تو اُسے
کوئی فوجی صاف نہ کرے بلکہ وہ جگہ مجرموں سے دھلوائی جائے۔ چنانچہ جو
لوگ پکڑے ہوئے آتے، انھیں پہلے اپنے بھائیوں کا خون صاف کرنا
ہوتا، پھر سزائے موت پاتے۔ انکار کرنے کی صورت میں کوڑوں کی سزا
دی جاتی تھی۔ ایک معزّز مسلمان نے خون کے دھبّے صاف کرنے سے انکار کیا
تو اُسے کوڑے لگا کر حکم دیا گیا کہ وہ اپنی زبان سے دھبّے صاف کرے۔

بہادر شاہ کا انجام

بہادر شاہ اور زینت محل نے غداروں پر بھروسا کرکے جو غلطی کی تھی، اُس کی سزا تو اُنھیں ملنا ہی تھی۔ مگر وہ اُس بدترین سلوک کے ہرگز مستحق نہ تھے جو انگریزوں نے اُن کے ساتھ روا رکھا۔ لال قلعے میں داخل ہوتے ہی انگریز افسروں کی طرف سے اُن پر لعن طعن شروع ہوگئی۔ اُس عمر رسیدہ، مجبور مگر ہندوستان کے سب سے بڑے آدمی کو جس افسر نے جو چاہا، کہا۔ ایک گورا تو اُنھیں دیکھ کر ایسا مغلوب الغضب ہُوا کہ بڑھ کر اُن کی ران پر ہاتھ مار دیا۔ اپنے بادشاہ کی اس طرح توہین ہوتے دیکھ کر ایک حبشی غلام تڑپ اُٹھا اور اُس نے گورے کو زمین پر پٹک دیا۔ اُس جاں نثار کو فوراً قتل کر دیا گیا، مگر اُس نے اپنی شجاعت سے انگریزوں پر ثابت کر دیا کہ اس ملک میں وفاداری کا تعلق اقتدار سے نہیں ہے۔ اُسی وقت بادشاہ اور مستورات کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا جس کے باہر گوروں کا پہرا تھا۔ شاہی خاندان کی خواتین کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ گوروں کی وحشی اور بے باک نظریں تھیں۔ چنانچہ وہ سمٹ سمٹا کر بادشاہ کے پاس بیٹھ گئیں۔

جب تک بادشاہ لال قلعے میں رہے، وہ انگریزوں کی تضحیک کا نشانہ بنے رہے۔ دن بھر آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ہندوستان کا شہنشاہ چھوٹے سے مکان کے ایک تنگ کمرے میں چارپائی پر پڑا حُقّہ پیتا رہتا اور آنے والے انگریز اُسے دیکھ کر اس طرح خوش ہوتے تھے جیسے وہ کوئی مسخرہ ہو۔

لال قلعے کی تلاشی لیتے ہُوئے انگریزوں کو جو سب سے بیش بہا خزانہ ملا، وہ ہندوستان کے نوابوں، راجاؤں، رئیسوں اور امیروں کے خطوط تھے جو جنگِ آزادی کے دوران میں اُنھوں نے بہادر شاہ کو لکھے تھے۔ ان کے علاوہ ایسے تمام کاغذات بھی مل گئے جن کا تعلق تحریک کی سرگرمیوں سے تھا۔ بہادر شاہ نے ایسے نازک حالات میں قلعہ چھوڑا تھا کہ ان ضروری دستاویزات کو تلف نہ کر سکے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ان کاغذات کی اہمیت سے ناواقف ہوں۔ بہرحال یہی کاغذ کے ٹکڑے نہ صرف بہادر شاہ بلکہ اُن کے بہت سے جاں نثاروں اور بہی خواہوں کے خلاف فردِ جُرم بن گئے۔ اب انگریزوں نے بادشاہ کے ساتھ ساتھ اُن تمام لوگوں کے خلاف مقدمے کی تیاری شروع کر دی جو لال قلعے سے کسی طرح کا بھی واسطہ رکھتے تھے۔

تقریباً چار ماہ تک کاغذات کی دیکھ بھال اور شہادتوں کا انتظام ہوتا رہا۔ تمام تیاریاں مکمّل کرنے کے بعد ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو مقدمے کا آغاز ہُوا۔ اکیس پیشیوں کے بعد ۹ مارچ کو فیصلہ سُنا دیا گیا۔

مقدمے کی سماعت کے لیے ایک فوجی کمیشن مقرّر کیا گیا تھا۔ اس

کمیشن کا سربراہ پہلے بریگیڈیئر شاور مقرر ہوا تھا، مگر اُسے کسی محاذ پر باہر جانا پڑا تو اُس کی جگہ لیفٹیننٹ کرنل ڈاز کا تقرر ہوا۔ ترجمانی کے فرائض جیمس مرفی کے سپرد تھے۔ اور میجر ہیریٹ ایڈووکیٹ جنرل تھا۔

عدالت لگانے کے لیے لال قلعے کا دیوانِ خاص تجویز کیا گیا۔

مغل بادشاہوں نے دیوانِ خاص اس لیے بنایا تھا کہ ان کی اولاد دہاں بیٹھ کر ملکی اور غیر ملکی معاملات میں اُمرا اور وزرا سے مشورہ کیا کرے۔ اسی دیوانِ خاص میں غیر ملکی سفیر بادشاہوں کو اپنی اسنادِ سفارت پیش کرتے تھے۔ یہی دیوانِ خاص تھا جہاں یورپی تاجروں نے متعدد بار مغل فرمانرواؤں کی قدمبوسی کا شرف حاصل کیا تھا اور اُن سے تجارتی مراعات حاصل کرنے لیے درخواست کی تھی۔ اسی دیوانِ خاص میں انگریز تاجروں نے مغل بادشاہوں کی خدمت میں اپنے بادشاہ کے بھیجے ہوئے تحفے پیش کرتے ہوئے ہندوستان اور مغل سلطنت کے وفادار رہنے کا حلف اُٹھایا تھا۔

مگر ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو ٹھیک گیارہ بجے اُسی دیوانِ خاص میں اکبرِ اعظم کا پوتا فوجی پہرے میں مجرم کی حیثیت سے لایا گیا۔

مقدمے کی کارروائی کے دوران میں بادشاہ کو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے لیے باہر ٹھہرایا گیا، کیونکہ بریگیڈیر شاور کی غیر موجودگی کو عین وقت پر محسوس کر لیا گیا تھا اور اُس کی جگہ لیفٹیننٹ کرنل ڈاز کا تقرر ہونا تھا۔ بہرحال ڈیڑھ گھنٹے تک باہر ٹھہرا کر جب بادشاہ کو بزعمِ خود عدالت اور گواہوں کے سامنے ذلیل کر لیا گیا تو نئے سرے سے مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ اب

بادشاہ کو صدر کمیشن اور ایڈووکیٹ جنرل کے درمیان بیٹھنے کی جگہ دے دی گئی۔ مقدمے کے دوران میں بادشاہ کے چہرے پر کسی طرح کی تشویش کے آثار نہ تھے۔ عدالت کی کارروائی کو وہ ایک غیر دلچسپ تماشے کی طرح لاپروائی سے دیکھ رہے تھے۔ بحث کے دوران میں انھوں نے دیر تک آنکھیں بند رکھیں، جیسے اُن پر غنودگی طاری ہو۔

مقدمے کی کارروائی میں کمیشن کے ممبر بہادر شاہ کو مجرم کی طرح مخاطب کرتے رہے۔ شاہی القاب و آداب کا استعمال تو کجا، وہ اُن سے "تم" کہہ کر بات کرتے تھے۔ مگر بادشاہ کو ذلیل کرنے کی انگریزی کوشش پر گواہوں نے پانی پھیر دیا۔ شہر میں انگریز کی حکومت تھی۔ دیوانِ خاص کے باہر انگریز فوجیوں کا پہرا تھا اور اندر عدالت کی کرسیوں پر تمام انگریز افسر بیٹھے تھے مگر ایک گواہ بھی طاقت اور اقتدار کے ان مظاہروں سے مرعوب نہ ہوا۔ جو بھی اندر آتا، پہلے بادشاہ کے سامنے مؤدبانہ جھک کر کورنش بجالاتا، پھر اُلٹے پیروں واپس ہو کر اپنی جگہ کھڑا ہو جاتا۔ تمام گواہوں نے ضرورت پڑنے پر بادشاہ کو "جہاں پناہ" کہہ کر مخاطب کیا۔

بہادر شاہ پر چار الزامات لگائے گئے :-

۱- انھوں نے انگریزوں کا وظیفہ خوار (جسے انگریز اپنا ملازم گردانتے تھے) ہوتے ہوئے انگریزی افواج کے افسروں اور سپاہیوں کو بغاوت پر آمادہ کیا۔

۲- بہادر شاہ نے سرکشوں کو طرح طرح سے مدد دی اور میرزا مغل کے

ذریعے عوام کو انگریزوں کے خلاف صف آرا کیا۔

۳۔ اگرچہ بہادر شاہ انگریزی رعایا میں سے تھے مگر اُنھوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور دہلی پر غاصبانہ قبضہ کر کے انگریزوں سے لڑے۔

۴۔ بہادر شاہ نے سازش کر کے انگریز عورتوں اور بچّوں کو قتل کرایا، اور قاتلوں کو انعامات اور خطابات سے نوازا۔ نیز مختلف ریاستوں کے حکمرانوں نے بھی بادشاہ کے اشارے پر انگریزوں اور عیسائیوں کا قتلِ عام کیا۔

بادشاہ کے خلاف گواہی دینے والوں میں حکیم احسن اللہ خان جیسے لوگ بھی تھے جو ہمیشہ اُن کے رفیقِ کار رہے۔ ان لوگوں نے بادشاہ کو قصوروار ثابت کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ دلیلوں سے ثابت کیا کہ چونکہ انگریزوں نے بادشاہ کو نذر قبول کرنے کی ممانعت کر دی تھی اور جواں بخت کو ولی عہد تسلیم کرنے سے اِنکار کر دیا تھا، اس لیے بادشاہ اُن سے خوش نہ تھے۔ اُنھوں نے انگریزوں کے خلاف غیر ممالک سے بھی سازباز کی تھی۔ گواہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی کہ جب قلعے میں انگریز بچّوں اور عورتوں کو قتل کیا جا رہا تھا تو بادشاہ نے اُنھیں اپنے زنانہ محل میں پناہ دینے سے اِنکار کر دیا تھا اور اس طرح وہ اُن کے قتل میں اعانت کے مرتکب ہوئے۔

اس مقدمے کی اکّیس پیشیوں کے دوران میں تقریبًا ایک سو اسّی کاغذات، اخباروں کے تراشے اور روزنامچے پیش ہوئے۔ ۹ مارچ کو جب آخری پیشی تھی تو بہادر شاہ نے اپنے وکیل غلام عبّاس کی مدد سے

تیار کیا ہوا تحریری جواب نامہ داخل کیا۔ اس بیان کا ترجمہ عدالت کو سنایا گیا۔
بادشاہ نے اپنے بیان میں خود کو ان ہنگاموں سے غیر متعلق ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اور بتایا تھا کہ اس عرصے میں وہ ایک مجبور اور بے بس آدمی کی طرح تھے جو سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر کچھ کرنے پر قادر نہ تھا۔ اپنی بے گناہی کے ثبوت میں اُنھوں نے کئی واقعات بھی پیش کیے تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ اس عرصے میں سرکش فوج کے ہاتھ میں ایک کھلونے کی طرح رہے۔

لیکن بادشاہ کے مستقبل کے لیے انگریز جو فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے، اُس کو نہ بہادر شاہ کی صفائی تبدیل کر سکتی تھی، نہ کروڑوں انسانوں کی پژمردگی۔ ۲۷ جنوری سے ۹ مارچ تک جو ڈراما کھیلا گیا، وہ محض رسمی تھا تاکہ تمام کارروائی انگریزی روایات کے مطابق ہو۔

عدالت برخاست ہونے سے پہلے ایڈووکیٹ جنرل نے بہادر شاہ کو تمام الزامات میں مجرم قرار دے دیا ــــ ۲۰ اپریل کو اعلیٰ افسروں نے اس فیصلے کی توثیق کر دی۔

جب ملزم کے خلاف جُرم "ثابت" ہو گیا تو سزا تجویز ہوئی۔ چونکہ جان بخشی کا وعدہ کیا جا چکا تھا، سزائے موت دینا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا حکومتِ ہند نے بادشاہ کے لیے حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا منظور کر لی۔ باقی تمام خاندان کو اُس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ بنگال میں نظربندی یا بادشاہ کے ساتھ جلا وطنی میں سے جو چاہیں پسند کر لیں ــــ تمام متعلقین نے بادشاہ

کے ساتھ رہنے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔

گرفتاری سے ایک سال دو ماہ بعد یعنی نومبر ۱۸۵۸ء میں مغل خاندان کے اس آخری بادشاہ کو دیس نکالا ملا اور یہ مختصر قافلہ دہلی سے کلکتہ روانہ ہُوا۔ اس میں بادشاہ، بیگمات، شہزادہ جواں بخت، اس کی بیوی، شہزادہ میرزا عباس، میرزا قیصر شکوہ اور کچھ ملازمین غرض کل سولہ افراد تھے۔

چھ سو گورے سپاہیوں کی حفاظت میں قیدیوں کا یہ جلوس جہاں جہاں سے گزرتا، گھروں میں صفِ ماتم بچھ جاتی۔ سراسیمہ اور مبہوت مرد، عورتیں اور بچّے اپنی اشکبار آنکھوں سے اُس وقت تک راستے کو تکتے رہتے، جب تک گردِ کارواں بھی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔

کلکتہ پہنچنے کے بعد بادشاہ کو فوراً بذریعہ جہاز رنگون بھیج دیا گیا۔ وہاں ان لوگوں کو ایک دو منزلہ مکان میں رکھا گیا، جس کے چاروں طرف گوروں کا پہرا تھا۔

سولہ افراد کے اس خاندان کے لیے چھ سو روپیہ پنشن منظور ہوئی جو بالکل ناکافی تھی۔ مگر زینت محل کے پاس جو زیورات بچ گئے تھے وہ اس قدر میں کام آئے۔

بہادرشاہ نے اس مکان میں داخل ہونے کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصّہ عبادت میں گزارتے اور کبھی چہل قدمی کے لیے بھی گھر سے باہر نہ نکلتے۔

آخر ۷ رنومبر ۱۸۶۲ء کو آٹھ سو سالہ اسلامی حکومت کے شبستان کا یہ

آخری چراغ گُل ہوگیا۔ اُنھیں مکان کے احاطے میں دفن کردیا گیا۔ آخری وقت اُنھوں نے وصیّت کی تھی کہ اُن کی لاش کو کسی مناسب وقت میں دہلی منتقل کردیا جائے۔ حکومتِ وقت نے اُن کی وصیّت پر عمل نہ کرکے اچّھا ہی کیا۔ کیونکہ اگر بہادر شاہ مستقل طور پر دہلی میں دفن کردیے جاتے تو خود اُن کی یہ پیش گوئی غلط ثابت ہوجاتی :

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ، دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی، کوئے یار میں

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسّلام پرنٹر اور پبلشر